طلوعِ اسلام

اکتوبر
سنہ ۱۹۵۴ء

۱۰/

اسلامی حیات اجتماعیہ کا ماہوار مجلّہ

طلوعِ اسلام

پوسٹ بکس ۷۳۱۳ — کراچی

قیمت فی پرچہ	مُرتّب	بدل اشتراک
دس آنے (پاکستانی)	سعید احمد	سالانہ: چھ روپے پاکستانی۔ (نو روپے ہندوستانی)
بارہ آنے (ہندوستانی)		۔ غیر ممالک سے ۲۱ شلنگ

جلد ۷	اکتوبر ۱۹۵۴ء	نمبر ۱۰

فہرست مضامین

طلوعِ اسلام کیا کہتا ہے؟	۴	حقائق و عبر	۵۵-۵۸
لمعات	۵-۹	۱- فرعونی روح۔	
دورانِ تلاوت میں	۱۱-۱۵	۲- قربانی کیوں فرض ہے؟	
(محترم عرشی صاحب)		۳- سرمایہ داروں کا مذہب۔	
رویتِ ہلال اور علمائے کرام۔	۱۶-۲۳	نقد و نظر	۵۹-۶۵
(محترم سید جعفر شاہ صاحب پھلواروی)		۱- غریب القرآن فی لغات القرآن	
تاویل اور خواب کی دنیا	۲۴-۳۸	۲- تاریخ فاطمیین مصر	
(از م۔ ع۔ خ)		۳- ملا کا اختلاف اشد ہے	
لغتِ عربی کی تدوین	۳۹-۵۴	ہمارا آپ کا مشترکہ مفاد	۶۶
(علامہ محترم احمد امین صاحب)		رفتارِ عالم	۶۷-۷۳

نہایت اہم اعلان: — ادارہ طلوع اسلام نے اب ڈاکخانہ میں پوسٹ بکس نمبر حاصل کر لیا ہے۔ لہٰذا آئندہ خط و کتابت کیلئے پتہ یہ ہوگا

یاد رکھئے: — ناظم ادارہ طلوع اسلام۔ پوسٹ بکس ۷۳۱۳ کراچی

پاکستان میں نظام شریعت رائج ہونا چاہئے -

لیکن یہ نظام شریعت ہوگا کیا ؟

(۱) اقتدار اعلیٰ خدا کا - اطاعت صرف اس کی -

(۲) خدا کی اطاعت کے معنی ہیں اسکی وحی کی اطاعت -

(۳) ایک وحی قران میں ہے - لیکن وہ مجمل ہے -

(۴) اس اجمال کی تفصیل دوسری وحی میں ہے جس کا نام احادیث ہے-

(۵) لہذا خدا کی اطاعت سے مراد احادیث کا اتباع ہے -

لیکن.... احادیث غلط بھی ہیں اور صحیح بھی -

یہ کون بتائے کہ صحیح احادیث کونسی ہیں اور غلط کونسی ؟

یہ صرف.... مزاج شناس رسول بتا سکتا ہے ؟

یہ مزاج شناس کون ہیں ؟

اسکی تفصیل ادارہ طلوع اسلام کی تازہ ترین پیشکش

مزاج شناس رسول

میں دیکھئے - ضخامت ۴۴۸ صفحات - مجلد معہ گرد پوش -

قیمت -/۴ روپے (علاوہ محصول ڈاک)

ناظم ادارہ طلوع اسلام - پوسٹ بکس نمبر ۷۳۱۳ - کراچی

طلوع اسلام کیا کہتا ہے؟

اگر آپ نے اس سے پہلے نہ سنا ہو تو اب سن لیجئے کہ

طلوع اسلام کبھی یہ نہیں کہتا کہ آپ مسلمانوں سے الگ ہٹ کر کوئی نیا فرقہ بنائیں۔ کیونکہ قرآن کی رو سے فرقہ بندی شرک ہے۔

طلوع اسلام کبھی یہ نہیں کہتا کہ آپ پانچ نمازیں نہ پڑھیں۔ تین پڑھیں۔ یا اس طرح نہ پڑھیں اس طرح پڑھیں۔

طلوع اسلام یہ کبھی نہیں کہتا کہ آپ مہینہ بھر کے روزے نہ رکھیں، نو دن کے رکھیں یا تین دن کے رکھیں۔

طلوع اسلام کبھی یہ نہیں کہتا کہ آپ حج نہ کریں۔

غرضیکہ طلوع اسلام کبھی یہ نہیں کہتا کہ آپ مسلمانوں جیسی زندگی بسر نہ کریں۔

طلوع اسلام فقط اتنا کہتا ہے کہ آپ جو کچھ کریں اس میں یہ دیکھ لیں کہ وہ اللہ کی منشاء کے مطابق ہو رہا ہے؟ اس کا طریقہ یہ ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ اس عمل کا وہ نتیجہ نکل رہا ہے یا نہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام پاک میں بیان کیا ہے۔ اگر وہ نتیجہ نکلتا ہے تو آپ کا عمل خدا کی منشاء کے مطابق ہے۔ اگر نہیں نکلتا تو وہ خدا کی منشاء کے مطابق نہیں ہے۔

اللہ نے قرآن میں کہا ہے کہ دین پر عمل کرنے کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہیں اس دنیا کی خوشگواریاں نصیب ہو جائیں گی اور آخرت بھی سنور جائے گی۔

لہٰذا اگر ہمارے اعمال سے ہمیں دنیا کی خوشگواریاں نہیں ملتیں۔ اگر لوگ بھوکے مرتے ہیں انھیں کپڑا نصیب نہیں ہوتا انھیں رہنے کو مکان نہیں ملتا۔ انھیں بین الاقوامی دنیا میں عزت نصیب نہیں ہوتی، تو ہمارے اعمال دین کے مطابق نہیں ہیں۔ انھیں دین کے مطابق کر لو تو تمہیں یہ سب کچھ مل جائے گا۔

طلوع اسلام بس اتنا کہتا ہے۔ جو شخص اس کے خلاف کوئی بات اس کی طرف منسوب کرتا ہے وہ فتنہ پھیلاتا ہے اور فساد برپا کرتا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

پاکستان میں نظم ونسق کی خرابیوں کا چرچا ہر زبان پر ہے۔ ان خرابیوں کی وجہ سے جو پریشانیاں پیدا ہوتی ہیں، عام طور پر ان کا شکار عوام کو ہونا پڑتا ہے، خواص اس سے محفوظ رہتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کے تدارک کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتا لیکن ہمارے خواص جس قسم کی پریشانیوں میں مبتلا ہیں وہ ان کیلئے کچھ کم سوہانِ روح نہیں ہیں۔ ان پریشانیوں میں سب سے بڑی فکر ونظر کی وہ پریشانی ہے جس میں یہ لوگ تشکیلِ پاکستان کے وقت سے آج تک مبتلا چلے آرہے ہیں اور کسی کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اس سے چھٹکارا کیسے ہو۔ تحریکِ پاکستان کے دوران میں انھوں نے اپنے مطالبہ کی بنیاد اس دعوٰی پر رکھی کہ ہم ایک الگ آئیڈیالوجی رکھتے ہیں اور ایک ایسا خطۂ زمین حاصل کرنا چاہتے ہیں جس میں اس آئیڈیالوجی کے مطابق زندگی بسر کی جاسکے۔ وہ خطۂ زمین حاصل ہوگیا تو پھر اس کی تلاش ہوئی کہ وہ آئیڈیالوجی کہاں ہے جس کے لئے اسے حاصل کیا گیا ہے۔ قائداعظم مرحوم کے ذہن میں اس آئیڈیالوجی کا کیا تصور تھا، اس کے متعلق تو کچھ کہا نہیں جاسکتا کیونکہ وہ تشکیلِ پاکستان کے تھوڑے دنوں بعد ہم سے جدا ہوگئے اور جتنے دن زندہ رہے، ابتدائی مشکلات نے اس کی فرصت ہی نہ دی کہ وہ اپنے تصور کی وضاحت فرما سکیں لیکن ان کے بعد تو ایسا نظر آتا ہے کہ کسی شخص کے ذہن میں اس آئیڈیالوجی کے متعلق کوئی متعین تصور ہے ہی نہیں۔ آپ اندازہ لگائیے کہ یہ مقام کس مصیبت کا ہے کہ تقسیم ہند سے پہلے برسوں تک اسلامک آئیڈیالوجی کے نعرے بلند ہوتے رہے اور تقسیم کے بعد پاکستان کے آئین کی بنیاد اسی آئیڈیالوجی پر رکھی گئی، لیکن کسی کو معلوم نہیں کہ یہ آئیڈیالوجی ہے کیا۔ چنانچہ اسی کا نتیجہ ہے کہ جب کبھی ان کے سامنے اس آئیڈیالوجی سے متعلق کوئی بات آجاتی ہے تو یہ بیچارے اس طرح سٹپٹا جاتے ہیں کہ ان کی حالت پر رحم آتا ہے۔ کوئی کچھ بولتا ہے، کوئی کچھ کہتا ہے، اور اس کے باوجود بات کچھ بنتی نہیں۔ لوگ مضحکہ اڑاتے ہیں۔ دنیا ہنستی ہے اور حساس قلوب اس پر خون کے آنسو بہاتے ہیں۔ اس صورتِ حالات سے مجلس آئین ساز کے غیر مسلم ارکان خاص طور پر فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ایک تو وہ گھر سے تیاری کرکے آتے ہیں۔ دوسرے انھیں معلوم ہوتا ہے کہ فریقِ مقابل کے ذہن میں ان امور کا کوئی متعین تصور نہیں اس لئے وہ انھیں اس طرح جھنجھوڑتے ہیں کہ ان سے کوئی بات بن نہیں پڑتی۔ مثلاً دسمبر کے آخری ہفتہ میں جب مجلس آئین ساز میں اقلیتوں کے متعلق مسئلہ پیش ہوا تو ہندو ارکانِ اسمبلی (جنھوں نے نومبر ۱۹۵۳ء سے اس اسمبلی کا بائیکاٹ کر رکھا تھا) متفقہ طور پر اسمبلی میں آگئے اور اس موضوع پر "اسلامی نقطۂ نگاہ سے بحث شروع کردی (جس کی تفصیل ۲۵ اگست اور یکم ستمبر کے "ڈان" میں شائع ہوئی تھی)۔ ہندو ممبروں نے کیا کیا کہا اور ہمارے اربابِ بست وکشاد کی طرف سے اس کا کیا جواب دیا گیا

یہ سب کچھ بڑی توجہ اور دلچسپی سے پڑھنے کے قابل ہے۔ ان کا سب سے پہلا اعتراض یہ تھا کہ اکثریت کی پارٹی نے پاکستان کو ایک "اسلامی مملکت" بنا دیا ہے جس کی وجہ سے غیر مسلم اقلیت کو خطرات پیدا ہو گئے ہیں۔ اس کے جواب میں سردار عبدالرب صاحب نشتر نے فرمایا کہ یہ تو محض نام رکھنے کا سوال ہے۔ روس نے اپنی مملکت کا نام سوشلسٹ ری پبلک رکھ چھوڑا ہے۔ ہم نے پاکستان کا نام اسلامک ری پبلک رکھ لیا ہے۔ جہاں تک ملک کے آئین کا تعلق ہے نام کا اس پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔

آپ اس جواب پر غور فرمائیے اور پھر سوچئے کہ یا تو ان حضرات کے دماغ اس تصور سے خالی ہیں کہ ایک مملکت کو اسلامی مملکت کہنے کا کیا مطلب ہوتا ہے اور یا ان کے سینے اس جرأت سے خالی ہیں جس کی بنا پر پورے زور سے اعلان کیا جا سکتا ہے کہ بیشک پاکستان ایک اسلامی مملکت ہے اور ہم نے اسے اسلامی بنانے کے لئے ہی حاصل کیا تھا۔ اگر ہم نے اسلامی مملکت کی تخلیق نہ کرنی ہوتی تو ہم ہندوستان سے علیحدہ ہی کیوں ہوتے۔ ہماری علیحدگی کی تو بنیاد ہی یہ تھی کہ ہندوؤں کے اندر رہتے ہوئے ہم مملکت کو اسلامی نہیں بنا سکتے تھے۔

باقی رہا یہ کہ مملکت کے نام کا اثر اس کے آئین پر کیا پڑتا ہے اس کی بابت ذرا روس سے پوچھئے جس کی مثال دی گئی ہے۔ کیا انھوں نے اپنی ری پبلک کا نام سوشلسٹ اس لئے نہیں رکھا کہ وہاں سوشلزم کا نظام رائج ہے؟ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ وہاں نظام تو سرمایہ داری کا رائج ہو اور نام سوشلسٹ رکھ لیا جائے؟ لیکن محترم نشتر صاحب بھی سچ فرماتے ہیں۔ ہمارے ہاں اس کا واقعی کچھ اثر نہیں پڑتا۔ ہم نے اپنی مملکت کا نام اسلامک رکھا لیکن جو آئین بنایا گیا ہے اسے اسلام سے دور کی بھی نسبت نہیں۔ یہ امر موجب اطمینان ہے کہ غیر شعوری طور پر ہی سہی ایک حقیقت کا اعتراف تو ہوا۔

اس کے بعد مسٹر چٹوپادھیا نے اعتراض کیا کہ مجلس آئین ساز نے یہ بھی فیصلہ کر دیا ہے کہ رئیس مملکت ہمیشہ مسلمان ہوگا۔ اس کے جواب میں کہا گیا کہ رئیس مملکت تو صرف ایک "آئینی رئیس" (یعنی نواب بے ملک) ہے۔ جس کے اختیارات کچھ بھی نہیں۔ پاکستان ایک آئیڈیالوجیکل اسٹیٹ ہے اور اس کا رئیس اس کی آئیڈیالوجی کا نشان ہے اور بس! لہٰذا اس میں بھی ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ کیا کہنے ہیں اس اسلامی مملکت کے کہ جس کے صدر کی حیثیت ایک بت سے زیادہ کچھ نہ ہو۔

مسٹر چٹوپادھیا کا اگلا اعتراض یہ تھا کہ پاکستان میں تھیاکریسی (ملّا راج) نافذ کی جا رہی ہے۔ جس میں جمہوریت کیلئے کوئی مقام نہیں ہوگا چنانچہ اس ضمن میں انھوں نے منیر رپورٹ کے حوالہ سے یہ کہا کہ جب اسلام میں شریعت کی تمام جزئیات تک پہلے سے مرتب اور مدون ہیں اور ان کی حیثیت ابدی اور دائمی ہے تو پھر ایک اسلامی مملکت میں قانون سازی کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے اور جب قانون سازی ہی نہیں تو پھر مجالس قانون ساز اور ان کی جمہوریت اور شورائیت بے معنی الفاظ رہ جاتے ہیں۔

اس کے جواب میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ تشتت فکر و نظر کی بڑی عبرت انگیز تصویر ہے۔ سب سے پہلے مسٹر خلیل الرحمٰن صاحب نے فرمایا کہ یہ کہنا کہ اسلام اور جمہوریت دو مختلف چیزیں ہیں اور اسلام میں کبھی جمہوری حکومت قائم نہیں ہوئی جہالت ہے جس کے جواب میں صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ جواب جاہلاں باشد خموشی۔

ہم محترم خلیل الرحمٰن صاحب سے دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ اگر مسلمانوں کی کسی مملکت کی مجلس قانون ساز کی اکثریت (خواہ وہ ننانوے فی صدی ہی کیوں نہ ہو) یہ فیصلہ کر دے کہ سور کا گوشت حلال ہے تو اس اکثریت کا یہ فیصلہ ملک کا قانون بن سکے گا، یا قانون اس اکیلے شخص کی آواز ہوگا جس نے اس کے خلاف رائے دی تھی؟ اگر اسلامی قانون اس ایک رائے کے مطابق ہوگا نہ کہ ننانوے کے مطابق، تو کیا یہ ڈیماکریسی کے مطابق ہوگا یا اس کے خلاف۔

نیز کیا ہم آپ سے یہ بھی دریافت کر سکتے ہیں کہ مسلمانوں میں کب جمہوری مملکت قائم ہوئی تھی۔ یعنی وہ جمہوریت جسے آج ڈیموکریٹک اسٹیٹ کہتے ہیں؟

سردار نشتر صاحب نے اس کے جواب میں فرمایا کہ اسلامی شریعت میں اجماع کا اصول موجود ہے اور یہ وہی چیز ہے جسے دورِ حاضر میں پارلیمانی انداز تقنین کہا جاتا ہے۔ ہم محترم سردار صاحب سے دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کی ساری تاریخ میں اس قسم کے اجماع کی آپ کوئی مثال بھی پیش کر سکتے ہیں؟ معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات نے محض اجماع کے لفظ سے یہ اندازہ لگا لیا کہ اس سے مقصود ایسے معاملات ہیں جو کہیں جمع ہو کر طے کئے جائیں۔ حالانکہ شریعت میں (یعنی ہماری فقہی شریعت میں) اجماع کا مفہوم اس سے بالکل مختلف ہے ـــــ پھر انھوں نے یہ فرمایا کہ

> قریب پچانوے فی صدی امور ایسے ہیں جنھیں قرآن نے خود انسانوں پر چھوڑ دیا ہے۔ اسلئے اسلامی مملکت میں انسانوں کے قانون سازی کے اختیار پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

یہ اعتراف بڑا خوش آئند ہے اور ہم دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ محترم سردار صاحب کو اس پر قائم رہنے کی توفیق عطا فرمائے اور ان کے ہم خیالوں کی تعداد میں (اگر کوئی ہیں تو) اضافہ فرمائے۔ لیکن ہم اتنا بادب پوچھنا چاہتے ہیں کہ آپ کی پاس کردہ قرار دادِ مقاصد میں (جسے آپ کی بنیادی اصولوں کی کمیٹی نے آئین کا جزو لاینفک قرار دیا ہے۔) قرآن کے ساتھ سنت کا لفظ بھی موجود ہے۔ اور (جیسا کہ منیر رپورٹ میں درج ہے) علمائے اہل سنت کے نزدیک زندگی کا کوئی مسئلہ ایسا نہیں جس کے متعلق سنتِ رسول اللہ (یعنی احادیث) میں پہلے سے فیصلہ موجود نہ ہو۔ یعنی قرآن نے جن پچانوے فی صدی امور کو غیر متعین چھوڑا تھا، ان کا تعین پہلے ہی سے احادیث میں ہو چکا ہے۔ اب یہ فرمائیے کہ

(۱) کیا آپ کے نزدیک یہ پوزیشن صحیح ہے یا نہیں؟

(۲) اگر صحیح ہے تو پھر آپ نے یہ کس طرح کہہ دیا کہ ہمیں پچانوے فیصدی امور میں قانون سازی کا حق حاصل ہے۔ اور

(۳) اگر یہ صحیح نہیں تو قرار دادِ مقاصد میں قرآن کے ساتھ سنت کے لفظ کے کیا معنی ہیں اور وہاں صرف قرآن کے بجائے قرآن اور سنت کیوں رکھا گیا ہے؟

چونکہ یہ امور دین اور پاکستان کے آئین دونوں میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں اسلئے ہم محترم سردار صاحب سے گذارش کریں گے کہ وہ ان کی وضاحت فرما دیں، جسے طلوع اسلام بمسرت شائع کریگا۔

مسٹر چٹوپادھیا نے یہ بھی اعتراض کیا کہ خدا کے اقتدارِ اعلیٰ (SOVEREIGNTY) کا تصور خود جمہوریت کے منافی ہے۔ اس کے جواب میں سردار عبدالرب صاحب نے فرمایا کہ انھیں قراردادِ مقاصد دیکھنی چاہئے جس میں لکھا ہے کہ خدا نے اپنے یہ اختیارات قوم کے منتخب افراد کے ذریعہ مملکت کو تفویض کر دیئے ہیں۔ لہٰذا پاکستان کا آئین جمہوری ہوگا۔

کیا محترم سردار صاحب فرمائیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ کہاں فرمایا ہے کہ ہم نے اپنا یہ اقتدارِ اعلیٰ قوم کے منتخب افراد کے ذریعہ مملکت کو سونپ دیا ہے؟۔

مسٹر چٹوپادھیا کے ایک اعتراض کے جواب میں محترم نشتر صاحب نے فرمایا کہ ۱۹۲۰ء میں ہندو مہاسبھا نے بنارس میں ایک کانفرنس کی تاکہ یہ فیصلہ کیا جائے کہ ہندو کسے کہتے ہیں۔ لیکن وہ "ہندو" کی کوئی جامع اور مانع تعریف متعین نہ کر سکے۔

ہم پوچھنا یہ چاہتے ہیں کہ کیا آپ کے پاس اس سوال کا جواب ہے کہ مسلمان کسے کہتے ہیں؟ آپ کو یاد ہوگا کہ فساداتِ پنجاب کی تحقیقاتی عدالت نے یہی سوال آپ کے مختلف علمائے کرام سے پوچھا تھا۔ اور (منیر رپورٹ میں اس کی شہادت موجود ہے کہ) ان میں سے کسی ایک کا جواب دوسرے سے نہیں ملا۔

مسٹر چٹوپادھیا نے کہا کہ آپ لوگ ہم سے یہ کہتے ہیں کہ ایک اسلامی مملکت میں اقلیتوں کی حیثیت قابلِ رشک ہوگی۔ اسلئے انھیں اس پر خوش ہونا چاہئے۔ اس پر انھوں نے پوچھا کہ اگر حقیقت یہی ہے تو پھر پاکستان کے مسلمان احمدیوں کو اقلیت قرار دینے پر کیوں مصر ہیں اور وہ اقلیت بننے سے کیوں گھبراتے ہیں؟

اس کا جواب کسی نے کچھ نہیں دیا۔ البتہ فرقہ بندی کے سلسلہ میں مسٹر خلیل الرحمٰن نے اس حقیقت کا (تاریخ میں غالباً پہلی بار) انکشاف فرمایا کہ فرقہ بندی سے مسلمانوں کے مذہب کو کبھی کوئی صدمہ نہیں پہنچا۔ سبحان اللہ! کتنی بڑی ہے یہ تحقیق اور کتنا بڑا ہے ان کا احسان مسلمانوں پر جنھیں انھوں نے بتا دیا کہ اسلام پر حقیقی صدمہ کا زمانہ تو وہ تھا جب نبی اکرم صلعم کے عہدِ مبارک میں کوئی فرقہ پیدا نہیں ہوا تھا اس کے بعد جب فرقے پیدا ہونے شروع ہو گئے تو پھر خطرات و صدمات کا دور ختم ہو گیا۔

مسٹر چٹوپادھیا نے اعتراض کیا کہ اسلامی مملکت میں ہندوؤں کو اپنے مذہب کی تبلیغ کی اجازت نہیں ہوگی اسلئے کہ اسلامی شریعت میں یہ حکم موجود ہے کہ جو مسلمان اپنا مذہب بدل دے اسے قتل کر دینا چاہئے۔ ہمیں اس کا جواب بھی کہیں نظر نہیں آیا۔

مسٹر چٹوپادھیا بار بار اس کا اعلان کرتے رہے کہ

> ہمارا عقیدہ ہے کہ پاکستان میں صرف ایک قوم بستی ہے اور وہ دن دور نہیں جب یہ تصور حقیقت بن کر سامنے آجائے گا اور میں مرنے سے پہلے اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں گا۔

مقامِ صد تاسف و حسرت ہے کہ یہ اعلان ان لوگوں کی بھری مجلس میں ہوتا رہا جنھوں نے پاکستان کا مطالبہ ہی اس دلیل پر منوایا تھا کہ مسلمان بربنائے مذہب ایک جداگانہ قوم ہے اور کوئی غیر مسلم اس قوم کا فرد نہیں بن سکتا۔ لیکن

ان میں سے کسی نے بھی ان مہاشے جی کا یہ کہہ کر منہ بند نہ کیا کہ اس کا یہ اعلان اسلام کی توہین اور پاکستان کے خلاف بغاوت کا اعلان ہے۔

لیکن ان لوگوں کو ایسا کہنے کی ہمت کس طرح سے ہوتی جو خود بنگال، پنجاب، سندھ، سرحد کی جغرافیائی نسبتوں سے الگ الگ قومیں بن رہے ہیں۔ اسلام کی طرف سے جواب وہی دے سکتا ہے جو خود اسلام پر عمل پیرا ہو۔ سنئے کہ اس باب میں اسی بھری مجلس میں خود ایک غیر مسلم (عیسائی) نے کیا کہا۔ اس نے غیر مسلم ارکان کو مخاطب کر کے کہا کہ

> میں چاہتا ہوں کہ پاکستان کا آئین نہ صرف نام کے اعتبار سے اسلامی ہو بلکہ عمل کے اعتبار سے بھی اسلامی ہو۔ ہمارے سامنے آج سوال یہ ہے کہ کیا ہم ایسا آئین چاہتے ہیں جو تصور اور عمل دونوں کے لحاظ سے حقیقی اسلامی آئین ہو؟۔ مجھے افسوس ہے کہ ہمارا مجوزہ آئین (جس پر ہماری موجودہ حکومت کی عمارت بھی استوار ہے) اسلامی تصورات اور مغربی جمہوری آئیڈیالوجی کا نہایت بھونڈا سا مرکب ہے۔ وہ سادگی جو ایک حقیقی اسلامی آئین کا بنیادی جوہر ہے ہمارے مجوزہ آئین میں بھی اس کا کہیں پتہ نہیں چلتا اور نہ ہی ہمارے موجودہ نظم و نسق حکومت میں اس کا کہیں سراغ ملتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نہ تو ہمارے ملک کے حالات ایسے ہیں کہ اس میں مغربی انداز کی جمہوریت راس آجائے اور نہ ہی ہمارے پاس ایسی وسعت اور ذرائع ہیں جن سے ہم مغربی انداز حکومت کی مسرفانہ عیاشیوں کے متحمل ہو سکیں۔ ہم خالص اور غیر مرکب اسلامی آئین چاہتے ہیں۔ ہمارے ملک کے لیڈر مدتوں سے اسلام کا نعرہ بلند کرتے چلے آرہے ہیں لیکن یہ امر کس قدر قابل افسوس ہے کہ ان کا کردار کبھی اسلام کی روح سے ہم آہنگ نہیں ہو سکا۔ وہ اسلام کا نام محض پروپیگنڈے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ اپنی حالت کی اصلاح کے لئے استعمال نہیں کرتے۔

یہ کہنے والے تھے مسٹر پی ڈی بھنڈارہ۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اس تنقید پر کسی اضافہ کی گنجائش نہیں۔ اے کاش جس بات کو ایک غیر مسلم نے سمجھ لیا ہے اسے ہمارے مسلمان رہنما بھی سمجھ سکتے۔ اور ملک کو ایک ایسا خالص اسلامی آئین دے سکتے جس کے حدود خود ان کے خدا نے اپنی غیر فانی اور غیر متبدل کتاب میں متعین فرما رکھے ہیں۔ مسٹر چٹوپادھیا کے اعتراضات کا جواب بھی اسی آئین سے مل سکتا تھا۔

نوٹ:۔ کاپیاں پریس جا رہی تھیں کہ یہ خبر موصول ہوئی کہ مجلس آئین ساز کی آخری نشست میں تمام کے تمام ہندو ارکان نے بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ کی مخالفت کی۔ کس قدر واضح ہے قرآن کا یہ فیصلہ کہ یہ لوگ کبھی تمہارے نہیں ہو سکتے اس لئے تمہارا آئین تمہاری اپنی مشاورت سے بننا چاہئے۔ ان کا اس میں کوئی دخل نہیں ہونا چاہئے۔

معارف القرآن

کی چار جلدیں شائع ہو چکی ہیں لیکن ان میں سے پہلی تین جلدیں مدت سے نایاب ہیں۔ قرآنی ذوق رکھنے والوں کے پیہم تقاضوں کے پیش نظر جناب پرویز نے ان جلدوں پر نظر ثانی کی ہے اور (علاوہ دوسری تبدیلیوں کے) ان کی ترتیب کو بھی بدل دیا ہے۔ چنانچہ

معارف القرآن جلد دوم

اب اس سلسلہ کی پہلی کڑی قرار دی گئی ہے اور اس کا نام رکھا گیا ہے۔

ابلیس و آدم

اس میں انسانی تخلیق (نظریۂ ارتقاء) قصۂ آدم۔ ابلیس۔ شیطان۔ جنات۔ ملائکہ۔ وحی اور رسالت سے متعلق مباحث شامل ہیں۔

ایسے اہم عنوانات۔ قرآن کی تعلیم۔ اور جناب پرویز کا قلم

آپ خود ہی اندازہ لگا لیجئے کہ کتاب کیا ہوگی!

یہ کتاب بڑی تقطیع (۲۲×۲۹/۸) کے ۳۷۶ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ جو ابھی پریس میں زیر طبع ہے امید ہے کہ جلد شائع ہو جائے گی اور جس ترتیب سے فرمائشیں آئیں گی اسی ترتیب سے اس کی روانگی ہوگی۔ لہذا اپنی فرمائش بہت جلد بھیجئے۔ قیمت مجلد مع گرد پوش آٹھ روپے (علاوہ محصول ڈاک)

جن حضرات کا روپیہ ہمارے پاس جمع ہے ان میں سے وہی صاحب اطلاع دیں جنہیں یہ کتاب درکار نہ ہو، باقی سب کو کتاب از خود بھیجدی جائے گی۔

ناظم ادارۂ طلوع اسلام۔ پوسٹ بکس ۳۱۳۔ کراچی

دورانِ تلاوت میں

(محترم عرشی صاحب)

حسب عادت صبح قرآن مجید کی تلاوت کر رہا تھا سورۂ مبارکہ نمل زیرِ تلاوت تھی یہ آیت عزیز سامنے آگئی۔

اِنک لا تسمع الموتیٰ ـــ ولا تسمع الصم الدعاء ـــ اذا ولوا مدبرین۔

تو مردوں کو نہیں سُنا رہا ـــ اور نہ ہی بہروں کے کانوں میں پکار رہا ہے ـــ جبکہ وہ پیٹھ پھیرتے ہوئے مڑ جاتے ہیں۔

اس کے بعد اگلی آیت پڑھی:-

وما انت بھٰدی العمی عن ضلالتھم ـــ ان تسمع الا من یومن بآیتنا فھم مسلمون۔

اور نہ ہی تو اندھوں کو ان کی گمراہی سے نکال کر راہ دکھانے والا ہے۔ تو صرف ان لوگوں کو سناتا ہے جو ہماری آیات کو مانتے ہیں۔

وہی لوگ فرمانبرداری کا حق بھی ادا کرتے ہیں۔

میں یہاں پہنچ کر رک گیا۔ دیر تک بیٹھا سوچتا رہا۔ آیتوں کا مفہوم اور اپنے موجودہ حالات سے اس کی مطابقت تفصیل کے ساتھ سامنے آتی گئی ـــ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جن لوگوں کو مردے، بہرے اور اندھے کہا گیا ہے ڈاکٹر اور طبیب کا فتویٰ ان کے حق میں ہرگز ایسا نہیں ہو سکتا وہ چلتے پھرتے تھے۔ سنتے، دیکھتے اور کھاتے پیتے تھے۔ خود اسی آیت میں ان کی جسمانی زندگی کا اعتراف ملتا ہے اذا ولوا مدبرین۔ جب وہ پیٹھ پھیرتے ہوئے مڑ جاتے ہیں۔ آخر کچھ سوچ سمجھ کر اور آیات کو ناقابلِ التفات جان کر ہی پیٹھ پھیرتے اور مڑ جاتے ہوں گے۔ اسی عمل سے ان کے اندر زندگی کا ثبوت بھی مل گیا اور سمع و بصر کا بھی۔ ایسی حالت میں کون ہے جو انھیں مردہ، بہرا اور اندھا بتائے۔

لیکن اس کا کیا علاج کہ یہاں کہنے والا خود خدائے بزرگ و برتر ہے جس کے متعلق ہر مسلمان کا ایمان ہے کہ من اصدق من اللہ قیلا اللہ سے بڑھ کر سچا کون ہو سکتا ہے۔ اور پیٹھ پھیر کر مڑ جانا جو ظاہری زندگی کی علامت ہے اسی کو مردگی اور بہرے پن کے ثبوت میں پیش فرمایا گیا ہے۔ اس سے ناچار یہ ماننا پڑے گا کہ یہ زندگی حقیقتاً زندگی ہی نہیں اور یہ سمع و بصر بھی سمع و بصر کہلانے کی مستحق نہیں جب تک آیات سے روگردانی کا شیوہ ترک نہ کریں ـــ اور زندگی آیات کو ماننے اور ان کے سانچے میں ڈھل جانے کا نام ہوا ـــ اس لحاظ سے اس کرۂ ارض پر زندگی ہے کہاں!ـــ آہ، کیا ہم سچ مچ لاشوں کی دنیا میں رہ رہے ہیں؟ یہ کسی مُلّا مولوی کا فتویٰ نہیں جس کو تنگ نظری کا مریض کہہ کر دل کو مطمئن کر لیں ـــ خدائے سمیع و علیم پورے وثوق سے "الّا" کہہ کر اس پر اپنی مہرِ تصدیق ثبت فرما رہے ہیں ـــ آج کون ہے جس کی زندگی آیات کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہو اور وہ اپنے آپ کو سنتا، دیکھتا اور زندہ کہہ سکے؟ حکیم سنائی غزنوی کے سامنے یہی آیات ہوں گی جب ان کے قلم سے نکلا۔

مردگی جہل و زندگی دین است   ہر چہ گفتند مغز آں این است

اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے بھی غالباً اسی کی ترجمانی کی ہے۔ ان کے قول کے الفاظ تو یاد نہیں مفہوم کچھ ایسا ہے۔

۔ احتیاط حلال میں ہوتی ہے۔ حرام تو دہکتی ہوئی آگ ہے جس میں مرنے گلگشت کیا کرتے ہیں۔ اگر ہنر نمو ہوتے تو آگ کی جلن ضرور محسوس کرتے۔

جو لوگ کھلے بندوں دوسروں کے حقوق پر ڈاکہ ڈالتے ہیں۔ امانتوں کو ہضم کر جاتے ہیں۔ رشوت کو شیر مادر سمجھتے ہیں۔ جھوٹ اور وعدہ خلافی ان کا روزمرہ ہے۔ ان کا نفس کبھی انھیں ان حرکات پر ملامت نہیں کرتا، بلکہ وہ صدق وصفا کو بیوقوفی خیال کرتے ہیں۔ ان کو مزمن کیسے مانا جا سکتا ہے عوام تو عوام اپنے آپ کو خواص سمجھنے والے بھی اس حمام میں عوام ہی کی طرح ننگے نظر آتے ہیں۔

پہلی آیت میں "ولوا" اور "مدبرین" کا مطلب صرف یہی تو نہیں کہ صرف جسم عنصری کو موڑ پھیر کر چلتے بنے بلکہ اس کی حقیقت التفات توجہ کا موڑنا ہوتا ہے۔ جب بات یہ ہے تو وہ لوگ جو آیات کو پڑھتے پڑھاتے اور سمجھتے سمجھاتے ہیں لیکن معاملات کی دنیا میں آکر بالکل عوام کے ہم پلہ ثابت ہوتے ہیں وہ اور بھی زیادہ اعراض وتولی کے مجرم ہوں گے کیونکہ ان کی دیکھا دیکھی عوام کی جرأت گناہ ـــ بے خوف ہو جاتی ہے۔ ایک مشہور روایت چلی آتی ہے کہ ایک بہت بڑے امام بازار میں گزر رہے تھے۔ مینہ برسنے کے بعد سڑک کیچڑ سے لت پت ہو رہی تھی۔ ایک لڑکا بھی ان کے آگے آگے جا رہا تھا انھوں نے ازراہ ہمدردی اسے آواز دی:۔

"بیٹا! کنارے کنارے چلو! کہیں پھسل نہ پڑنا"۔ لڑکے نے مؤدبانہ کہا۔ ـــ "حضرت! شکریہ۔ لیکن آپ میری فکر نہ کیجئے۔ اپنی احتیاط رکھئے کیونکہ میرا پھسلنا تنہا میرا ہی پھسلنا ہوگا اور اگر آپ پھسل پڑے تو ساری امت پھسل جائے گی"۔

مسیح علیہ السلام نے اپنے حواریوں سے کہا تھا:

تم زمین کا نمک ہو۔ نمک جس سے ہر چیز کا ذائقہ درست کیا جاتا ہے۔ اگر نمک ہی بگڑ جائے تو باقی چیزوں کا کیا حال؟

جب آیات کے مفسر ومترجم آیات کا وعظ کہنے والے، اسٹیج اور منبر پر کھڑے ہو کر رونے اور رلانے والے ہی اپنے آپ کو آیات کے سانچے میں ڈھلنے پر تیار نہ ہوں اور عمل کے وقت صاف صاف پیٹھ بھی پھیر لیں اور منہ بھی موڑ لیں تو بہرہ گی اور سمع وبصر سے محرومی نہیں تو کیا ہے۔

تقسیم ملک سے پہلے بھی ہم ایسے ہی تھے اور تقسیم کے بعد تو گویا

دشتِ جنوں میں اہلِ جنوں سے بچھڑ گیا وہ آخری رفیق لنگوٹا کہیں جسے

ہم نے اپنے اوپر سے اخلاق وشرافت کا ہلکے سے ہلکا پردہ بھی اتار پھینکا ـــ اربابِ سیاست کو ان کی سیاسی بازیگری سے کون روکے؟ کاروباری لوگوں کو ان کے داؤں پیچ سے کون باز رکھے؟ سرکاری دفتروں کے کارکنوں کے حلق میں جاتے ہوئے خنزیر کو کون کھینچ کر باہر نکالے؟ جبکہ نکالنے والے ہاتھوں میں بھی خنزیر کی ران تھمی ہوئی ہو۔

میں بہت ہی جلے ہوئے اور دکھے ہوئے دل سے "طلوع اسلام" کو کہتا ہوں۔

اے "طلوع اسلام"! انک لا تسمع الموتی۔ کیا تو مردوں کو سنا رہا ہے؟ بہروں کو پکار رہا ہے؟ اندھوں کو راہ کی طرف اشارہ کر رہا ہے؟ تیرے پڑھنے والے تیری تحریروں پر وجد کرتے ہیں۔ تیرے عجیب وغریب فقروں کو یاد کر کے ایک دوسرے کو سناتے ہیں۔ تجھ پر داد وتحسین کے جوتی کچھاور کرتے ہیں۔ لیکن معاملات کی دنیا میں آکر کیا وہ دوسروں سے ممتاز ہیں؟ وہ لوگ جنھوں نے انسانی تاریخوں کو

دین سمجھ رکھا ہے۔ شاید وہ کسی حد تک معذور سمجھے جائیں۔ لیکن قرآن کو دین سمجھنے والے اپنے عمل سے قرآن کے مکذب ثابت ہوں تو ان کا ان کی قوم کا اور ساری دنیا کا انجام کیا ہوگا۔ یہ میں اسلئے کہہ رہا ہوں کہ قرآن ساری دنیا کیلئے ہے اور قرآن کے مبلغ ساری دنیا کی فلاح و اصلاح کے مدعی ہیں حالانکہ ان کا قدم اپنی اصلاح کی طرف اٹھنے سے بھی سخت قاصر ثابت ہورہا ہے انھیں عام لوگوں سے اتنا ہی ممتاز ہونا چاہئے تھا جتنا قرآن تمام بشری تعلیمات میں ممتاز و سربلند ہے۔

اسلام نے دنیا کو صرف کاغذوں اور ورقوں کی طرف نہیں بلایا تھا وہ تو کردار کی طرف دعوت تھی۔ کردار جو سامنے نظر آرہا تھا۔ پہلے ایک شخص (صلعم) میں، پھر دو میں، پھر تین میں حتیٰ کہ جو شخص ان لوگوں کا ساتھی بنتا تھا وہ کردار کا ساتھی ہوتا تھا۔ گفتار و بیان پرداز و تحسین کی وہاں کوئی اہمیت ہی نہیں تھی۔ یہی وجہ تھی کہ چند سالوں میں پورے ملک کی کایا پلٹ ہوگئی اور یہاں ہم صدی تو ہو ہی گئی ہوگی۔ سرسید کے وقت سے قوم کو جھنجھوڑنا شروع ہوا۔ کئی تحریکیں اٹھیں، ملک و حکومت پر بھی قبضہ مل گیا۔ آیات کو اپنانے کی خارجی رکاوٹیں سب دور ہوگئیں مگر ہم ہیں کہ آیات سے دور تر ہی ہوتے چلے گئے۔ وہاں کفار و مشرکین مخاطب تھے جن میں حیرت انگیز تبدیلی آگئی اور یہاں آیات کا ادب و احترام کرنے والے ہیں جو تیس، چالیس، پچاس برس درس قرآن سنتے ہیں۔ نماز روزے کی پابندی کرتے ہیں۔ حج و زکوٰۃ کا فریضہ بھی ادا کرتے ہیں۔ بحث و کلام میں اپنی صداقت و تفوق ثابت کرنے میں بھی ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ لیکن بولنے، تولنے اور معاملہ کرنے کے وقت ہی وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِينَ کا مصداق ثابت ہوتے ہیں کہ اپنے ظاہر و باطن میں جتنی مطابقت رکھتا ہے کاش ہمارے ایمان کو اس کا دسواں حصہ ہی نصیب ہوجاتا!

چارۂ کار

سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس گورستانی جمود کا کچھ علاج بھی ہے؟ یا یوں ہی ع

ہم کہیں اور سنا کرے کوئی

عزیزانِ گرامی! سفر تو قدم اٹھانے ہی سے طے ہوگا اور یہاں ابھی قافلہ ہی مرتب نہیں ہوا۔ "طلوع اسلام" برسوں سے "من انصاری الی القرآن" کی صدا بلند کررہا ہے، لیکن "نحن انصار القرآن" کے جواب کیلئے کان ترس رہے ہیں۔ اس دنیا میں جھوٹے پیروں ملت فروش عالموں اور قوم کو ہلاکت کے گھاٹ اتارنے والے جعلی نبیوں کو تو انصار مل جاتے ہیں جو ان کیلئے اپنی جانیں اور دولتیں قربان کرنے کو سعادت دارین یقین کرتے ہیں، لیکن خدا کی کتاب کے حقیقی انصار شاذ ہیں۔ راقم نے جب سے ہوش سنبھالا یہی دیکھا کہ ایک شخص اٹھتا ہے وہ "قرآن قرآن" پکارتا ہوا دنیا سے رخصت ہوجاتا ہے لیکن اس کو ایسے ساتھی نہیں ملتے جو قرآن کی عملی تشکیل میں اس کے معاون ہوکر دنیا کے سامنے ثابت کرسکیں کہ قرآن ہی ایک ایسا دستور العمل ہے جو انسان کو فوق الانسان بنا سکتا ہے۔ شمس العلماء مولانا محب الحق عظیم آبادی مرحوم اور خواجہ احمد الدین امرتسری مرحوم کے نمونے ہمارے سامنے ہیں ان کی تصانیف نے نظریاتی تبدیلی ضرور پیدا کی۔ مولانا اسلم جیراجپوری نے احقاق حق و ابطال باطل میں نہایت متین و سنجیدہ کوشش کی لیکن کتنے مسلمانوں نے ان بزرگوں کا ساتھ دیا؟

آج "طلوع اسلام" اس مقدس فریضے کو ادا کررہا ہے لیکن اس کی چیخ و پکار بھی اب تک منفردانہ کوشش سے آگے نہیں بڑھ سکی۔ کوئی بھی تحریک اس وقت تک جاندار نہیں ہوسکتی جب تک وہ فرد سے آگے بڑھ کر جماعت کے دلوں میں گھر نہ کرجائے اور ایک مضبوط جماعت

ے سنہ ۱۸۷۰ء میں سرسید کا ہفتہ وار "تہذیب الاخلاق" زور شور سے نکل رہا تھا اور مدرسۃ العلوم علی گڑھ کی بنیاد پڑ رہی تھی۔

اس کو اپنی زندگی کا نصب العین نہ بنالے۔ ایسی جماعت جس کو اپنے نصب العین سے عشق ہو جو اس کے لئے ہر قربانی کرنے کو تیار ہو نصب العین جب وقت مانگے تو دے، مال طلب کرے تو بخل نہ ہو، جاں بازی کا موقع آجائے تو دریغ نہ ہو۔ پھر اس میں استحکام و استقامت اس حد تک ہو کہ کوئی بھی سخت سے سخت رکاوٹ اس میں لچک نہ پیدا کر سکے بلکہ مصداق۔ ع

بڑھتا ہے اور ذوقِ گنہ یاں سزا کے بعد

عشق و شیفتگی میں اضافہ ہی ہوتا جائے۔ دنیا کی تاریخ مختلف قسم کی سیاسی، مذہبی، سائنسی، علمی، ادبی تحریکوں سے معمور ہے۔ ان میں سے آگے بڑھنے اور زندہ رہنے والی ایک بھی تحریک ایسی نہیں جس کی پشت پر عاشقانہ فدائیت اور صادقانہ عزم و ہمت کے لوگ نہ ہوں۔ حاملانِ تورات کے مصائب، مبلغین انجیل کی ایذا پسندی، سابقین قرآن کی بے پناہ صعوبتیں اور ان مقدس اصحاب سے نیچے اتر کر عام مصلحین امم کی جانی و مالی قربانیاں اس پر شاہد ہیں۔

روایتی تحریکوں کے مقابلے میں قرآنی تحریک کے پھلنے پھولنے سے محرومی کا عظیم سبب یہی ہے کہ ابھی تک اس کے حامیوں میں وہ انہماک و ایثار پیدا نہیں ہوا جس کی ضرورت ایسی تحریکوں کو آگے بڑھنے کیلئے ہوا کرتی ہے۔ ان میں فکری تغیر ضرور رونما ہو چکا ہے لیکن عملی زندگی بالکل مترفین کے ساتھ ملتی جلتی ہے۔ شاید وہ امید لئے بیٹھے ہیں کہ ادارہ طلوع اسلام کی تصانیف و مقالات ہی کوئی معجزہ دکھا کر قوم کو قرآن کی طرف لے آئیں گے اور صحیح قرآنی زندگی پیدا کر دیں گے لیکن افسوس ہے کہ ایسا معجزہ تو کوئی آسمانی کتاب بھی نہیں دکھا سکی۔

لو ان قرآنا سیرت بہ الجبال او قطعت بہ الارض او کلم بہ الموتی بل للہ الامر جمیعاً

کسی بھی آسمانی کتاب یا قرآن کو یہ وصف نہیں دیا گیا کہ محض اس کی تاثیر قرأت ہی سے پہاڑ اپنی جگہ سے ہل جائیں یا اس کے اعجازی اثر سے قدم اٹھائے بغیر زمین کے فاصلے طے ہونے لگیں، یا اس کے ورد و تلاوت ہی سے کشف القبور کی کرامتیں رونما ہو جائیں۔ اس کائنات میں تمام اختیار، حکومت اور قانون اللہ تعالیٰ ہی کا دائر و سائر ہے ــــ اس قسم کے چاؤ اور امنگوں سے آج تک کچھ ہوا ہے اور نہ ہوگا۔ اور یہ بھی تو قرآن ہی میں لکھا ہے کہ

ام حسبتم ان تدخلوا الجنۃ ولما یأتکم مثل الذین خلوا من قبلکم مستھم البأساء والضراء وزلزلوا حتی یقول الرسول والذین اٰمنوا معہ متی نصر اللہ الا ان نصر اللہ قریب۔

کیا تم اس خوش فہمی میں مبتلا ہو کہ بیٹھے بٹھائے صرف رسالے اور کتابیں پڑھ لینے ہی سے جنت مقصود کو حاصل کر لو گے حالانکہ تم ابھی ان حوصلہ شکن حالات سے دوچار نہیں ہوئے جن سے متقدمین کو سابقہ پڑ چکا ہے۔ انھوں نے جب بھی امتوں کے افکار و کردار کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا تو انھیں طرح طرح کے دکھوں اور مصیبتوں کا سامنا ہوا اور وہ کانپ اٹھے۔ بسا اوقات یہاں تک بھی نوبت پہنچ گئی کہ پیغمبر وقت اور اس کے اصحاب کی زبانوں پر یہ الفاظ جاری ہو گئے کہ "اللہ تعالیٰ کی امداد کا وقت کب آئے گا۔"

یہ بات سمجھ لینے کی ہے کہ اس نازک مقام پر پہنچ کر اللہ تعالیٰ کی امداد نزدیک نظر آنے لگتی ہے ــــ اس آیت کے خاتمے کے ساتھ ہی "ماذا ینفقون" کا سوال لگا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ جب تک ہم اپنے نصب العین کی خاطر اپنی قوت، اپنا وقت اور اپنا مال

خرچ کرنے سے دریغ کرتے رہیں گے ہمارے تمام اقدام سطحی اور لفظی ہی رہیں گے۔ ان کا کوئی ٹھوس نتیجہ نہیں نکلے گا۔

اب میں پھر اپنے خاص حلقے سے مخاطب ہوتا ہوں۔ آپ نے آج تک کیا کیا؟ صرف یہی کہ قرآنی طرزِ فکر پیدا کرنے والی چند کتابوں کا مطالعہ کیا اور اس کے نتیجے میں روایتی اور فرقہ پرستانہ طور و طریق سے جو ہمیشہ تباہی و بربادی پر منتج ہوتے ہیں ایک حد تک اپنے اندر بیزاری پیدا کر لی۔ بلا شبہ یہی کرنے کا کام تھا اور اس راہ میں پہلا قدم یہی ہو سکتا تھا

ہر بنائے ساکہ آباداں کنند — اول آں بنیاد را ویراں کنند

لیکن یہ تو ایک خالص منفی عمل ہے۔ کوئی بھی شخص اپنی ذاتی مساعی میں صرف منفی پر قناعت کر کے نہیں بیٹھ سکتا۔ جہاں تک منفی رجحان کا تعلق ہے آپ نے ایک حد تک کامیابی حاصل کر لی۔ آپ نے قوم کے ایک حصے کے ہاتھوں سے زہر ہلاہل کی وہ بوتل چھین لی جسے وہ آبحیات سمجھ کر حلق میں انڈیلنے والا تھا لیکن کیا اس کے بعد آپ کا یہ فرض نہیں کہ آپ سچ مچ کا آبِ حیات اس کیلئے مہیا کریں؟ وہ آبِ حیات قرآن حکیم کا تعمیری پروگرام ہے جس پر اپنی حد تک سب سے پہلے آپ کو خود عمل کرنا ہوگا۔ قوم کے تمام بکھرے ہوئے شیرازے کو مجتمع کرنے کیلئے قرآنی برادری کے ہر فرد کو اپنے اندر امتیازی اوصاف پیدا کرنے ہونگے اگر درخت اپنے پھلوں سے پہچانا جاتا ہے تو قرآنی درخت کے پھل ہر دوسرے درخت سے بہتر اور عمدہ ہونے چاہئیں۔ اگر معاملے کی کسوٹی پر ہم عام فرقہ پرستوں ایسے یا ان سے بھی بدتر ثابت ہوئے تو ہم اپنے ساتھ قرآن کی عزت پر بھی حرف رکھنے کا باعث ہوں گے۔

قرآنی تعلیم بلا شبہ ابرِ رحمت ہے جس کی لطافت و نظافت اور حیات بخشی و جاں پروری شک و شبہ سے بالاتر ہے لیکن اس سے سیراب ہونے کیلئے زمین بھی ایسی ہونی چاہئے جس میں صلاحیت ہو۔ اگر ہم لوگ زمین شور ہی بنے رہے اور اغراض و توئی کی نجاست سے پاک نہ ہوئے تو یہ ایک تاریخی ترجمعی ہوگی جس کی تلافی غیر ممکن ہو جائے گی۔ کارکنانِ قضا و قدر کی نگاہیں ہمیشہ اس قوم کی طرف لگی رہتی ہیں جو الٰہی قانون کو اپنی زندگی میں اور پھر تمام عالمِ انسانی میں رائج کرنے کیلئے قدم اٹھائے۔ ادھر سے ایک قدم راسخ اٹھتا ہے اُدھر سے کئی تائیدی قدم آگے بڑھتے ہیں۔

اس وقت تک کی ساری چیخ پکار کے نتیجے میں صرف ایک شہر قرآن کی بزم طلوعِ اسلام ہے کبھی کبھی جنبشِ حیات کا ثبوت ملتا ہے۔ کراچی، ڈھاکہ، لاہور اور راولپنڈی جو بہ ترتیب مرکزی حیثیت رکھتے ہیں خاموش ہیں۔ ان عظیم شہروں میں ہمارے کام کی رفتار قطعاً تسلی بخش نہیں۔ حد یہ ہے کہ ساری دنیا کو قرآن کی آغوش میں پناہ دینے کے مدعی آپس میں بھی ایک دوسرے کو نہیں پہچانتے۔ حالانکہ قرآن نے نظام کے قصرِ بلند کی بنیاد ہی تالیفِ قلوب اخوت پر رکھی تھی۔

فالف بین قلوبکم فاصبحتم بنعمتہ اخوانا وکنتم علی شفا حفرۃ من النار

اس آیت مجیدہ سے صراحۃً ثابت ہے کہ جن لوگوں میں تالیفِ قلوب اور رشتہ مواخات موجود نہیں وہ آگ کے گڑھے کے کنارے پہ کھڑے ہیں اور آج کل ہی میں اس میں گر کر بھسم ہو جانے والے ہیں۔ دوسری جگہ فرماتے ہیں انما المؤمنون اخوۃ فاصلحوا بین اخویکم۔ قرآنی نظام کی عظمت و برتری پر یقین رکھنے والے لازماً آپس میں ایک دوسرے کے بھائی بھائی ہو جاتے ہیں ان کو حکم دیا گیا ہے کہ اس برادرانہ تعلق کی اصلاح و درستی میں ہرگز غفلت نہ کریں۔ ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے۔

لو انفقت ما فی الارض جمیعاً ما الفت بین قلوبھم ولکن اللہ الف بینھم

اس آیت نے پکار کر کہہ دیا کہ تمام کرۂ ارض کے مال خزانے معدنیات اور جواہرات ایک طرف اور فرزندانِ توحید کی الفتِ قلوب ایک طرف۔ اس روحانی دولت کے مقابلے میں ان مادی سامانوں کی کوئی حقیقت نہیں ــــ ان سطور کے ذریعہ حلقہ طلوعِ اسلام کے حساس نوجوانوں کی خدمت میں درخواست

رویتِ ہلال اور علمائے کرام

(محترم سید جعفر شاہ صاحب پھلواروی)

جن مہینوں کے ہلال کو ہمارے معاشرے میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ ان میں شاید ہی کوئی مہینہ ایسا ہو جس کی رویتِ ہلال میں اختلاف نہ ہوتا ہو۔ اس اختلاف کو دور کرنے کی اپیل کیجئے تو فوراً ایک "حدیث" پڑھ کر سنا دی جاتی ہے کہ "اختلاف امتی رحمۃ" (میری امت کا اختلاف رحمت ہے) صحاح، سنن، مسانید، موطات، مصنفات، معاجم غرض دنیا کی کسی کتاب حدیث میں یہ حدیث موجود نہیں لیکن اسے خوب اچھالا گیا ہے جس کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ اختلافات باقی رہیں اور پارٹی لیڈر شپ پر زد نہ آئے۔ اگر گروہی تعصبات بالکل ختم ہو جائیں تو بہت سے لوگوں کی سیادت و قیادت بلکہ ان کا وہ مصرف ہی ختم ہو جاتا ہے جس سے ان کا مفاد عاجل وابستہ ہے یہ جھوٹی اور جعلی روایت (اختلاف امتی رحمۃ) کچھ اس انداز سے پیش کی جاتی ہے کہ گویا اتحادِ امت رحمت نہیں ہے۔ صرف اختلافِ امت ہی سراپا رحمت ہے۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ رمضان اور عید الفطر ہی میں نہیں بلکہ عید الضحیٰ کے دس دنوں میں بھی یہ حضرات رویتِ ہلال کی صحیح تاریخ نہیں معین کر پاتے۔

غالباً سال گزشتہ ہی کا واقعہ ہے کہ پنجاب کے ایک شہر میں ۲۹ کے حساب سے سرکاری اعلان کے مطابق ایک مولوی صاحب نے نماز عید پڑھائی۔ ایک دوسرے مولوی صاحب نے اعلان فرمایا کہ یہ نماز باطل ہے کیونکہ اول تو یہ سرکاری عید ہے اور دوسرے یہ مولوی دیوبندی ہے جس کے کفر میں شک کرنا ہی کفر ہے۔ غرض ان مولوی صاحب نمبر ۲ نے دوسرے دن عید کی نماز پڑھائی۔ اس کے بعد ایک اور صاحب نے اعلان فرمایا کہ یہ مولوی نمبر ۲ بھی مشرک ہے کیونکہ بریلوی مولوی ہے لہٰذا یہ نماز عید بھی باطل ہوئی۔ چنانچہ انھوں نے تیسری نماز ادا فرمائی۔ اب آپ کو نہ پہلی عید پر اعتراض کا حق ہے نہ دوسری اور تیسری نماز عید پر۔ کیوں؟ اسلئے کہ اختلاف امتی رحمۃ

اس سلسلے میں رویتِ ہلال کی شہادتوں پر جو شاعری فرمائی گئی وہ بھی کچھ کم دلچسپ نہیں۔ لاہور کی رویتِ ہلال کمیٹی کے جلسۂ مشاورت میں ڈی۔ سی نے کہا کہ یہ دیکھئے لائل پور کے ڈپٹی کمشنر صاحب فون پر بول رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ میں نے اور فلاں فلاں صاحب نے چاند دیکھا ہے۔ اس پر ایک مولوی صاحب بولے کہ کیا پتہ ٹیلی فون پر کون بول رہا ہے الصوت یشبہ الصوت۔ جس طرح ایک کا خط دوسرے سے مشابہ ہوتا ہے اسی طرح ایک آواز بھی دوسری آواز سے مشابہ ہوتی ہے۔ غرض چاند کی شہادت میں نہ خط کا اعتبار ہے نہ تار کا، نہ ٹیلیفون کا اور نہ ریڈیو کا۔ غالباً ان حضرات کے نزدیک ہلال عید وغیرہ کے موقعہ پر پوری قوم اپریل فول منانے پر تلی رہتی ہے۔ لہٰذا ایسے مواقع پر کوئی شہادت معتبر نہیں ہوگی۔ ایک اور موقع پر کچھ لوگوں نے ہلالِ عید کی گواہی دی تو ان سب کی گواہیاں صرف اسلئے رد کر دی گئیں کہ ان میں سے بعض کی ریش . . . . منڈی ہوئی تھی۔ بھلا ایسے دقیق مسائل آپ کو اور کہاں مل سکتے ہیں؟

اب وقت آگیا ہے کہ ہر روز کی اس بیکار کی الجھن کو بالکل ختم کر دیا جائے اور اس کی صرف ایک شکل ہے اور وہ یہ ہے کہ فلکی حساب پر اعتماد کر کے اعلان کر دیا جائے کہ فلاں دن سے فلاں مہینہ شروع ہو گا۔ ہمارے علمائے کرام کو فلکیات کے علم پر غالباً کوئی اعتماد نہیں کیونکہ حدیث شریف میں صرف اتنا آیا ہے کہ صوموا لرؤیتہ وافطروا لرؤیتہ۔ چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور چاند دیکھ کر عید کرو۔

ایک امی اور سادہ ترین تمدن رکھنے والی امت کو اس سے زیادہ اور کیا بتایا جا سکتا تھا؟ جو امت لکھنا پڑھنا بھی نہ جانتی ہو اس کیلئے بجز رویت کے اور کیا طریقہ تجویز فرما سکتے تھے۔ وہاں فلکی تقویم کے وہ انکشافات موجود نہ تھے جو دورِ جدیدہ کی پیداوار ہیں۔ نیز اس وقت رویت کا بدل صرف ایسی عینی شہادتیں ہو سکتی تھیں جو قرب و جوار سے حاصل ہو جائیں۔ اور اس قرب و جوار کی مسافت اتنی مختصر و محدود ہو کہ ایک انسان — پیدل یا سوار — آسانی سے چند گھنٹوں میں خبر لیکر آجائے۔ اب حالات بدل چکے ہیں۔ رسل و رسائل کا یہ حال ہے کہ ہزاروں میل سے چوتھائی سیکنڈ میں خبریں آجاتی ہیں۔ مسافت اتنی سکڑ گئی ہے کہ مہینوں کا راستہ گھنٹوں میں طے ہو جاتا ہے۔ فلکی علوم اور تقویمات کا یہ عالم ہے کہ اب وثوق کے ساتھ معلوم ہے کہ:۔

۱- ۲۹ دن، ۱۲ گھنٹے، ۴۴ منٹ اور ۲.۷۸ اعشاریہ سیکنڈ میں چاند اپنی گردش پوری کر لیتا ہے۔

۲- ۳۶۵ دن ۶ گھنٹے ۹ منٹ اور ۹.۵ اعشاریہ سیکنڈ میں زمین اپنی مداری گردش پوری کرتی ہے۔

اور آج پورے وثوق کے ساتھ مہینوں پہلے یہ پیشگوئی کر دی جاتی ہے کہ

۱- اتنے بجکر اتنے منٹ اور اتنے سیکنڈ پر فلاں جگہ چاند گہن یا سورج گہن لگنا شروع ہو گا۔

۲- اور چاند یا سورج کے اتنے حصے پر گہن لگے گا اور پھر کم ہونا شروع ہو گا۔

۳- اور اتنی دیر تک فلاں جگہ اور اتنی مدت تک فلاں جگہ گہن قائم رہے گا۔

اسی طرح آج پورے وثوق سے بتا دیا جاتا ہے کہ

۱- فلاں آلہ روشنی یا برق کی صحیح رفتار کو بتا دیتا ہے۔

۲- اور فلاں آلے کی مدد سے ایک سیکنڈ کا ہزارواں حصہ معلوم کیا جا سکتا ہے۔

۳- اور فلاں شعاعوں کی مدد سے جزء لایتجزی کا تجزیہ کیا جا سکتا ہے۔

اس دورِ علوم و فنون میں یہ سمجھنا کہ انسان طلوعِ ہلال کی صحیح تاریخ و وقت نہیں بتا سکتا عجیب خوش فہمی ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ مختلف حلقے (AREAS) معین کر دیئے جائیں کہ فلاں حلقے یا منطقے میں فلاں دن اور فلاں ایریا میں فلاں وقت چاند نکلے گا۔ اس فلکی حساب پر اعتماد کر کے اسلامی تقریبات ادا کرنے میں کوئی شرعی قباحت نہیں معلوم ہوتی۔ اگر فلکی حسابات میں یا ریڈیو، تار، خط اور ٹیلیفون میں غلطی یا شرارت کا امکان ہے تو یقین کیجئے کہ غلطی و شرارت کا اتنا ہی امکان حلفیہ شہادات میں بھی موجود ہے۔ جس قدر دوسرے ذرائع سے آنے والی خبریں غلط ثابت ہوتی ہیں اس سے بہت زیادہ جھوٹا حلف ہر روز عدالتوں میں اٹھایا جاتا ہے۔

اس موقع پر میری طرف سے کچھ سننے کے بجائے صبحی محمصانی کی زبان سے سنئے وہ اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے۔ کہ امعلول ید دہ

مع علتہ وجوداً وعدماً (معلول اپنی علت کے ساتھ موجود و معدوم ہوتا ہے) لکھتے ہیں کہ:۔

وعلی ھذہ القاعدۃ جوز بعضھم اثبات اوائل الشھور العربیۃ وخاصۃ شھر رمضان المبارک ۔ بالحساب الفلکی وفسر واذلک بان الحدیث الشریف الذی امر باعتماد رؤیۃ الھلال وحدھا لاجل الصیام جاء معللاً بعلۃ منصوصۃ وھی ان الامۃ امیۃ لاتکتب ولاتحسب ۔ فاذا خرجت الامۃ عن امیتھا وصارت تکتب وتحسب . . . ولکن الناس ان یصلوا الی الیقین والقطع فی حساب اول الشھر . . . اذا صار ھذا شانھم فی جماعتھم وزالت علتنا الامیۃ وجب ان یرجعوا الی الیقین الثابت وان یاخذوا فی اثبات الاھلۃ بالحساب وحدہ و ان لا یرجعوا الی الرویۃ الاحین یستصعب علیھم العلم بہ۔

اور اسی قاعدے کی بنا پر بعض فقہا نے فلکی حساب سے اسلامی مہینوں خصوصاً رمضان کے ہلال کی تعیین کو جائز قرار دیا ہے اور اس کی تشریح یوں کی ہے کہ وہ حدیث جس میں روزے کے متعلق صرف رویتِ ہلال پر اعتماد کرنے کا حکم ہے ایک منصوص علت کے ساتھ وابستہ ہے اور وہ یہ ہے کہ (مخاطب) امت امی واقع ہوئی تھی جو لکھنا اور حساب کتاب کرنا نہیں جانتی تھی۔ لہٰذا جب یہ امت امیت سے نکل کر لکھنے پڑھنے اور حساب وکتاب کے لائق ہو گئی اور لوگوں کیلئے ہلال کے حساب میں یقین اور قطعیت تک پہنچنے کا امکان وسامان پیدا ہو گیا تو اس عمومی صورتِ حال کے ہوتے ہوئے اور امیت کی علت ختم ہونے کے بعد اب یہی ضروری ہے کہ لوگ اس (حسابی) قطعیت ویقین کی طرف رجوع کریں۔ اور ہلال کو معلوم کرنے کیلئے تنہا (فلکی) حساب وکتاب کا طریقہ اختیار کریں۔ اور رویت کے (سابق طریقے) کی طرف وہیں رجوع کریں جہاں فلکیات کا جاننا دشوار ہو۔

محمصانی نے یہ پوری عبارت اپنی مشہور عالم کتاب "فلسفۃ التشریع" میں احمد شاکر کی کتاب "اوائل الشھور العربیۃ" سے نقل کی ہے جو اسی مضمون پر لکھی گئی ہے کہ اب ہلال کے معاملہ میں فلکی حساب پر بلا تامل اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ اس عبارت سے جو نکات معلوم ہوتے ہیں وہ یہ ہیں کہ:۔

۱۔ معلول ہمیشہ اپنی علت کے ساتھ بدلتا رہتا ہے۔

۲۔ ہلال دیکھ کر صوم وافطار کا حکم اس امت کے لئے ہے جو امی ہو۔ اور فلکیات سے واقف نہ ہو۔ نہ خبریں پہنچائی جا سکتی ہوں، نہ اخبار وغیرہ پہنچتے ہوں۔ اب بھی ایسی جگہوں میں رویت ہی پر دارومدار ہو گا۔

۳۔ لیکن جہاں یہ مجبوریاں نہ ہوں وہاں بلا تامل فلکی علم کے مطابق تعیین ہلال کی جا سکتی ہے اور اسی کے مطابق اسلامی تقریبات ادا کی جا سکتی ہیں۔

اس کے علاوہ ذرا یہ بھی ملاحظہ فرمائیے کہ آج پوری امت کس طرح اپنے بعض خالص دینی معاملات میں حساب وکتاب ہی پر اعتماد کر رہی ہے اور یہ اعتماد بالکل قابل اعتراض نہیں سمجھا جاتا۔ مثلاً

۱۔ آج کوئی بھی سحری کے وقت اٹھ کر سیاہ اور سفید دھاری کے امتیاز کو نہیں دیکھتا۔ فلکی حساب ہی کے مطابق نقارہ یا سائرن بجتا ہے یا گولا چھوٹتا ہے اور لوگ اس پر اعتماد کرتے ہیں۔

۲۔ بلکہ افطار کے وقت بھی غروبِ آفتاب کی رویت کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی اور فلکی ریاضیات ہی پر اعتماد کیا جاتا ہے۔

۳۔ اب ایک نمازی بھی سایہ ناپ کر یا اپنی آنکھوں سے شفق وغیرہ کو دیکھ کر نماز نہیں پڑھتا بلکہ فلکی حساب کے مطابق جو اوقات نامے مسجدوں میں آویزاں ہوتے ہیں ان ہی پر اعتماد کر کے ساری نمازیں ادا کر لی جاتی ہیں (گھڑیاں بھی تیز اور سست ہونے کی اور بعض اوقات بند ہو جانے کی غلطی کر جاتی ہیں لیکن اس امکانِ خطا کے باوجود بہرحال اس پر بڑی حد تک اعتماد ہوتا ہے)۔

۴۔ اگر فلکی حساب سے یہ اعلان کر دیا جائے کہ فلاں وقت چاند یا سورج گرہن لگے گا اور اسی کے مطابق صلوٰت الکسوف یا صلوٰۃ الخسوف کا اعلان کر دیا جائے تو اس اعلان کو ہرگز خلافِ شریعت نہ قرار دیا جائے گا۔

غرض کئی جگہ دینی معاملے میں فلکیات پر اعتماد ہوتے ہوئے اگر ہلالِ رمضان و عید میں بھی فلکیات پر اعتماد کر لیا جائے تو کون سی قیامت آ جائے گی؟ اگر کبھی فلکی حساب غلط بھی ہو جائے تو ایک دن کے آگے پیچھے ہو جانے سے عبادت میں کوئی قابلِ گرفت فرق نہیں پڑتا۔ ایک حلقے میں آج شب قدر یا عید ہے اور دوسری جگہ کل۔ اختلافِ رویت کی شکل میں علماء کے نزدیک دونوں ہی درست ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر فلکیات کے مطابق ایک حلقے (ZONE) میں دو ماہرینِ فلکیات معین کر دیں، پوری امت ایک ہی دن رمضان یا عید منائے تو اس میں بجز اس کے اور کیا نقصان ہے کہ اس حلقے کے کچھ لوگ ایک دن آگے یا پیچھے کھسک جائیں گے؟ فرق صرف یہ ہوگا کہ رویت پر اعتماد کرنے میں اختلاف کے ساتھ ایک دن آگے پیچھے کھسک جاتے ہیں اور فلکیات پر اعتماد کرنے کی صورت میں اتحاد کے ساتھ ایک دن آگے یا پیچھے کھسک جائیں گے۔ روز روز کے جھگڑے ختم کر کے اس اتحاد میں جو ایک دن کا تقدم و تاخر کا ظاہری نقصان نظر آتا ہے وہ اس فائدہ کے مقابلے میں کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ جو اتحادِ امت اور ختمِ نزاع کر حاصل ہوگا۔

اس سلسلے میں نامناسب نہ ہوگا اگر ہر عربی مہینے کی پہلی تاریخ معلوم کرنے کا ایک قاعدہ درج کر دیا جائے جو "تقویم الاوقات" میں درج ہے۔ یہ کتاب حکومتِ سعودیہ کی طرف سے عرصہ ہوا شائع ہوئی ہے۔ ہمارے لئے یہ دعویٰ مشکل ہے کہ یہ قاعدہ کلیہ بلا استثناء ہے۔ ہم اہلِ علم کے غور و فکر کیلئے یہ قاعدہ درج کرتے ہیں۔ اس کے بکثرت صحیح ہونے میں تو کوئی شبہ نہیں لیکن اگر اس میں کوئی سقم ہو تو اہلِ علم اسے دور کر سکتے ہیں۔ فرض کیجئے آپ کو یہ معلوم کرنا ہے کہ یکم ذی الحجہ ۱۳۷۳ھ کس دن پڑے گی تو پہلے ۱۳۷۳ کو آٹھ سے تقسیم کیجئے، باقی بچے پانچ۔ اب دیکھئے کہ "ا ہ ج ز د ب و د" میں پانچواں حرف "د" ہے جس کے عدد (بحساب جمل) ۴ ہیں۔ اس ۴ کو ذہن میں رکھئے۔ اب دیکھئے ذی الحجہ بارھواں مہینہ ہے اور "ز ب ج ہ و ا ب د ہ ز ا ج" میں بارھواں حرف "ج" ہے جس کے عدد ہیں ۳۔ اب ۴ اور ۳ کو جمع کر کے اس میں ایک اور جمع کیجئے تو یہ ہوئے ۸۔ اب اس ۸ کو ۷ سے تقسیم کیجئے تو بچا ایک۔ اب یک شنبہ، دو شنبہ، سہ شنبہ کو میں ایک نمبر یک شنبے کا ہے لہٰذا یکم ذی الحجہ ۱۳۷۳ھ یقیناً یک شنبے کی ہوگی۔ دوسرے لفظوں میں دسویں ذی الحجہ سہ شنبے کو ہوئی۔ اسی حساب سے یکم محرم ۱۳۷۴ھ سہ شنبہ کو ہوگی۔ اس طرح آپ ہر سنہ کے کسی مہینے کی تاریخ معلوم کر سکتے ہیں۔ اگر سنہ کو آٹھ پر تقسیم کرنے کے بعد کچھ نہ بچے تو آٹھواں حرف یعنی "د" لیا جائے گا جس کے عدد ۴ ہیں اور پھر دوسری تقسیم میں (جو ۷ سے ہوگی) کچھ نہ بچے تو یک شنبے سے شروع کر کے ساتواں دن لیا جائے گا جو شنبہ ہے۔

ہم نے اس قاعدے کو صحیح تو پایا ہے لیکن ابھی اس پر پورا وثوق نہیں کیونکہ اس میں سالِ کبیسہ و بسیطہ کا کس طرح لحاظ ہوتا ہے اسے پوری طرح سمجھ نہیں سکے ہیں۔ بہرحال یہ قاعدہ بھی علمائے فلکیات ہی کا بتایا ہوا ہے اور اس سے مدد لی جا سکتی ہے۔ ہم تو اتنا جانتے ہیں کہ اگر یہ قاعدہ پوری

طرح کلیہ نہ ہو بلکہ صرف اکثری ہو جب بھی اسے قبول کر کے اختلافِ امت کو ختم کرنے میں نقصان سے زیادہ فائدہ ہے۔

فلکی حساب سے ہلال کی تعیین میں سب سے ضروری چیز منطقوں (ZONES) کی تعیین ہے اور یہ ماہرینِ فلکیات ہی کر سکتے ہیں۔ یہ کام شرح وقایہ کے عالموں کا نہیں بلکہ جغرافیہ و فلکیات کے علما کا ہے۔ ہم صرف اس بارے میں اتنا عرض کر سکتے ہیں کہ اسلامی تقریبات کیلئے فلکی ریاضیات پر اعتماد کرنا کوئی شرعی جرم نہیں اور نہ یہ کتاب و سنت کے خلاف ہے۔ دن اور رات کی گردش ہی اسلئے ہے کہ تعلموا عدد السنین والحساب (تاکہ تم کو سنوں کی تعداد اور ان سے متعلق حساب و کتاب کا علم ہو)۔ غبار آلود مطلع ہونے کی صورت میں بیرونی شہادت لی جاتی ہے جس کا مقصد شبہے کو دور کر کے قطعیت تک پہنچنا ہوتا ہے لیکن ہمارے بزرگوں کو اس سے انکار نہیں کرنا چاہیے کہ فنی و علمی تحقیق کا درجہ عینی شہادت کم نہیں بلکہ بعض اوقات زیادہ ہوتا ہے اور رویت محضہ پر فنی بصیرت کو ترجیح حاصل ہوتی ہے فلکی حسابات بھی دراصل شہادات ہی ہیں اور قوی شہادات ہیں۔

اب اس نظریہ کی تائید میں کچھ اور چیزیں بھی سن لیجئے۔ امام قرطبیؒ ہدایۃ المجتہد (مطبوعہ قاہرہ ۱۳۵۶ھ صفحہ ۲۷۵) میں فرماتے ہیں:۔

وروی عن بعض السلف انہ اذا غمی الھلال رجع الی الحساب بمسیر القمر والشمس وھو مذھب مطرف بن شخیر وھو من کبار التابعین وحکی ابن سریج عن الشافعی انہ قال من کان مذھبہ الاستدلال بالنجوم ومنازل القمر ثم تبین لہ من جھۃ الاستدلال ان الھلال مرئی وقد غم فان لہ ان یعقد الصوم ویجزیہ۔

بعض بزرگوں سے مروی ہے کہ اگر مطلع غبار آلود ہو تو شمس و قمر کی چال یعنی فلکی حساب کی طرف رجوع کیا جائے گا۔ مطرف بن شخیر کا یہی مسلک ہے اور ان کا شمار اجل تابعین میں ہوتا ہے اور ابن سریج امام شافعیؒ کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ جو شخص ستاروں اور منازل قمر سے استدلال کرنے کا مسلک رکھتا ہو (یعنی ماہر فلکیات ہو) اور اسے فلکی و فنی دلیل سے یہ معلوم ہو جائے کہ ہلال طلوع ہو چکا ہے جو ابر میں چھپا ہے تو اسے روزہ رکھ لینا چاہیے اور یہ اس کیلئے کافی ہے۔

علامہ عبدالرحمٰن نے "الفقہ علی المذاہب الاربعہ" (مطبوعہ مصر ۱۳۵۸ھ صفحہ ۵۵۱) میں ایک عنوان قائم کیا ہے "ھل یعتبر قول المنجم" (کیا ماہر فلکیات کی بات قابلِ اعتماد ہے) اس عنوان کے تحت وہ لکھتے ہیں:۔

اما قول المنجمین فھو وان کان مبنیا علی قواعد دقیقۃ فانا نراہ غیر منضبط، بدلیل اختلاف آرائھم فی اغلب الاحیان. وھذا ھو رای ثلاثۃ من الائمۃ وخالف الشافعیۃ فقالوا یعتبر قول المنجم فی حق نفسہ وحق من صدقہ ولا یجب الصوم علی عموم الناس بقولہ علی الاصح۔

ماہرینِ فلکیات کا قول اگرچہ بڑے دقیق قاعدوں پر مبنی ہوتا ہے لیکن ہم اسے نامکمل سمجھتے ہیں اور اس کی دلیل یہ ہے کہ ان کی رایوں میں اکثر و بیشتر اختلاف ہوتا ہے۔ یہ تو ہے ائمہ ثلاثہ (ابو حنیفہؒ، مالکؒ، احمد بن حنبلؒ) کی رائے۔ لیکن شافعیہ اس رائے کے خلاف ہیں وہ کہتے ہیں کہ عالم فلکیات کا قول خود اس منجم کیلئے قابلِ اعتماد ہے اور اس کیلئے بھی جو اس پر اعتبار کرتا ہو۔ ہاں عوام پر روزہ واجب نہیں ہوگا، اور یہ شافعیہ کی دو روایتوں میں سے راجح رائے ہے۔

اوپر کی دونوں عبارتوں سے جو نکات واضح ہوتے ہیں وہ یہ ہیں:۔

(۱) مطرف بن شخیرؒ جو اجل تابعین میں ہیں، کا مسلک یہ ہے کہ مطلع ناصاف ہونے کی صورت میں فلکی حساب پر عمل کیا جائے گا۔

(۲) امام شافعی رحؒ کا بھی یہی مسلک ہے لیکن وہ اس عموم میں کچھ تخصیص فرماتے ہیں یعنی خود ماہرِ فلکیات کے لئے فلکی حساب قابلِ اعتماد ہے اور اس کے لئے جو اس ماہر پر اعتماد رکھتا ہو۔

(۳) عوام کیلئے فلکی حساب قابلِ اعتماد ہے یا نہیں اس کے بارے میں شافعیہ کی بھی دو رائیں ہیں اور راجح قول یہ ہے کہ عوام اعتماد نہ کریں۔

(۴) ائمہ ثلاثہ فلکی حساب کو قابلِ اعتماد نہیں سمجھتے کیونکہ

(الف) ان کے نزدیک یہ فن ابھی مکمل نہیں۔ (ب) اور فن کے ماہرین کی رایوں میں بکثرت اختلاف ہوتا ہے۔

اگر ہم سنجیدگی سے ان نکات پر غور کریں تو گفتگو کی گنجائش کئی پہلوے پیدا ہو جاتی ہیں۔ وہی ہذہ:

یہ کوئی ضرور نہیں کہ فقہاء کے کسی دور میں اگر کوئی فن ناقص ہو تو ابد تک وہ ناقص و ناکمل ہی رہے ایسا دور بھی آ سکتا ہے کہ جس فن پر اس کے ناکمل ہونے کی وجہ سے زیادہ اعتبار نہیں کیا جاتا تھا اس پر اب اعتماد کیا جائے۔ ارتقاء ایک مسلسل قانونِ قدرت ہے اور اس کے مطابق بے شمار فنون اپنے کمال کی طرف بڑھ رہے ہیں اور سچی بات تو یہ ہے کہ کوئی فن کتنا ہی اوج کمال پر پہنچ جائے اس میں پھر بھی کچھ نہ کچھ نقص رہے گا۔ سبوحیت اور بے عیبی صرف ذات باری تعالیٰ کیلئے مخصوص ہے۔ ہر دور میں ارتقاء کے باوجود ہر فن میں کوئی نہ کوئی خامی رہے گی اور یہی خامی انسان کو ارتقاء کی طرف دھکیلتی رہے گی۔ اس کے باوجود ہر دور میں فنون پر اعتماد کیا جائے گا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ فن طب مکمل ہو گیا ہے؟ یا فن جہاز رانی اور فن ہوا بازی مکمل ہو گیا ہے؟ ہر روز غلط تشخیص و تجویز سے لوگ مرتے ہیں، جہاز ڈوبتے اور طیارے گرتے ہیں لیکن آخر ان فنون پر اعتماد کیا ہی جاتا ہے۔ اگر فن فلکیات پر بھی اعتماد کر لیا جائے تو کیا قیامت آجائے گی۔ درآنحالیکہ یہ فن اپنی تکمیل میں اس وقت کسی فن سے پیچھے نہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ شاید چند سالوں میں کسی ہلال کی تعیین کرنے میں غلطی ہو جائے گی لیکن یہ نقصان اس نقصان سے بہت کم ہے جو امت کے سالانہ اختلاف و افتراق سے پیدا ہوتا ہے۔

پھر اس کے فنی نقص کی یہ دلیل کہ اس کے ماہرین کی رایوں میں بہت اختلاف ہوتا ہے کوئی وزنی دلیل نہیں وہ کون سا فن ہے جس کے ماہرین میں اختلاف نہیں ہوتا؟ ہر فن کے علماء میں ایک سے زیادہ رائیں ہوتی ہیں لیکن اس فن کو محض اس وجود اختلاف کی وجہ سے کلیۃً رد نہیں کر دیا جاتا۔ اگر یہ طریقہ اختیار کیا جائے تو سب سے پہلے پوری فقہ اسلامی کو رد کرنا پڑے گا کیونکہ کوئی سا بھی اہم فقہی مسئلہ ایسا نہیں جس میں دس طرح کی رائیں نہ ہوں جن میں صرف اختلاف ہی نہیں ہوتا بلکہ تناقض و تباین تک ہوتا ہے۔ یہی حال فن حدیث و فن تفسیر کا ہے اور ہر دینی فن کا ہے لیکن صرف اتنی سی بات کو ان دینی فنون کے ناقابلِ اعتماد ہونے کی دلیل نہیں بنایا جا سکتا۔

اس باب میں امام شافعیؒ نے ترقی پسندانہ قدم اٹھایا ہے۔ اپنے دور میں ان کے لئے اس سے زیادہ ترقی پسندانہ اقدام شاید ممکن نہ تھا۔ اس کی دو وجہیں معلوم ہوتی ہیں، ایک تو یہ کہ اس وقت فلکیات کا فن اتنا مکمل اور ترقی یافتہ نہ ہوگا جتنا بعد میں ہوا۔ دوسرے یہ کہ ابتداء میں ترقی پسندانہ قدم ہمیشہ ہلکا ہی ہوا کرتا ہے جس کی مثال یوں سمجھئے کہ ایک عرصۂ دراز تک اہل اسلام میں یہ خیال قائم رہا کہ قرآن کی بہت سی آیتیں منسوخ ہیں (ان سب کو جمع کیجئے تو تقریباً چوتھائی قرآن منسوخ ہو جاتا ہے) شاہ ولی اللہ دہلویؒ اس خیال کی اصلاح چاہتے تھے لیکن جو خیال صدیوں سے چلا آرہا تھا اس کی کلی نفی فتنہ پیدا کر سکتی تھی لیکن اپنا مصلحانہ قدم ذرا احتیاط کے ساتھ اٹھایا اور یہ لکھا کہ زیادہ سے زیادہ چار پانچ ہی آیتیں

ایسی ہیں جن کے متعلق نسخ کا گمان کیا جاسکتا ہے اس کے بعد انھوں نے ہر ایسی دو آیتوں میں توافق پیدا کرکے دکھایا جن میں ایک کو ناسخ اور دوسری کو منسوخ قرار دیا جاتا رہا تھا۔ شاہ صاحب نے دراصل ایک دروازہ کھول دیا ہے جس کی غرض صرف یہ ہے کہ آئندہ آنے والے ان آیتوں کی بھی تاویل کردیں جن کے متعلق شاہ صاحب نے نسخ کی گنجائش باقی رکھی ہے اس طرح یہ قصہ ناسخ و منسوخ ختم ہوجائے گا۔

بالکل یہی انداز امام شافعیؒ نے اختیار فرمایا ہے انھوں نے علم فلکیات پر اعتماد کرنے کا دروازہ کھول دیا ہے۔ اس وقت یہ فن اتنا زیادہ مکمل نہ تھا کہ اس پر کلی اعتماد کرلیا جائے۔ امام شافعیؒ نے اس پر اعتماد کا دروازہ اس مناسب انداز سے کھولا ہے کہ جیسے جیسے اس فن کی ترقی ہوتی جائے ویسے ویسے اس پر اعتبار کرنے والے بھی فلکی حساب پر اعتماد کرتے جائیں اور رفتہ رفتہ عوام کے لئے بھی اس پر اعتماد کرنے کی راہ کھل جائے۔ یہی وجہ ہے کہ شوافع میں اس کے متعلق دو رائیں ہیں۔ ایک کے نزدیک عوام بھی اس حکم میں داخل ہیں اور دوسری کے نزدیک عوام کو اس پر اعتماد نہ کرنا چاہئے ۔ مؤخر الذکر رائے شافعیہ کے نزدیک قابل ترجیح اور اصح ہے "اصح" ہمیشہ صحیح کے مقابلے میں بولا جاتا ہے نہ کہ غلط کے مقابلے میں، لیکن یہ ضروری نہیں کہ ایک دور کا "اصح" ہر دور کیلئے اصح ہو۔ زمان و مکان کا اختلاف مسائل میں بلاشبہ تبدیلی کردیتا ہے اور کسی فقیہ کو اس سے انکار نہیں۔

ابوبکر جصاص اپنی کتاب "احکام القرآن" (مطبوعہ مصر ۱۳۴۷ھ ص ۲۲۶) میں یہ تو اعتراف کرتے ہیں کہ صوم و افطار دونوں میں فلکی حساب پر ایک جماعت اعتماد کرتی ہے لیکن وہ اس اعتماد کو صحیح نہیں سمجھتے اور اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ:۔

وبما كانت هذه عبادة تلزم الكافة لم يجز ان يكون الحكم متعلقا بما لا يعرفه الا الخواص من الناس ممن عسى لا يسكن الى قولهم۔

چونکہ یہ (صوم و افطار) ایسی عبادت ہے جو تمام اہل اسلام پر لازم ہے اسلئے اسے کسی ایسے فن سے وابستہ نہیں ہونا چاہئے جس کو صرف خاص خاص لوگ جانتے ہوں اور وہ بھی ایسے ہوں کہ ان کی باتوں پر پورا اطمینان نہ ہوسکے۔

جصاص نے عدم اعتماد کی جو وجہ بتائی ہے وہ زیادہ وزنی نہیں معلوم ہوتی۔ جہاں تک فن کا تعلق ہے کوئی فن بھی ایسا نہیں جس کے حقائق عوام کو معلوم ہوں لیکن ان سب سے عوام کا تعلق ہوتا ہے اور وہ کسی سے اپنا تعلق کلیۃً توڑ نہیں سکتے۔ دنیوی معاملات ہی میں نہیں بلکہ خالص دینی معاملات میں بھی۔ آج عوام تو عوام ہزاروں علمائے دین ایسے موجود ہیں جو قانون وراثت کے مبادیات سے بھی واقف نہیں حالانکہ موت و زندگی اور ترکہ و وراثت کا تعلق ساری قوم سے ہے اور جو علما اس سے واقف ہیں ان میں زیادہ تر ایسے ہیں جو وارثوں کی تقسیم حصص میں بیسیوں غلطیاں کرجاتے ہیں۔ اب کیا قرآنی قانون وراثت کو محض اسلئے ترک کردینا چاہئے کہ اس کے جاننے والے صرف چند خواص ہی ہیں؟ اور ان میں بھی بعض ایسے ہیں جن کے فن پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ صرف وراثت ہی نہیں بلکہ آج تو نماز روزے اور حج و زکوٰۃ کے موٹے موٹے مسائل بھی عوام نہیں جانتے۔ وہ عربی زبان اور عربی لغات اور صرف و نحو سے بھی واقف نہیں۔ تو کیا ان سب چیزوں کی واقفیت کیلئے دوسرے اہل فن پر اعتماد نہیں کرنا چاہئے؟ فنون تو ہوتے ہی اس شکل کے ہیں کہ جو نہیں جانتے وہ جاننے والوں سے اعتماد کے ساتھ اخذ کریں۔ بہرکیف ہمیں سردست اس سے زیادہ بحث نہیں کہ جصاص نے فلکیات پر اعتماد نہ کرنے کی جو وجہ لکھی ہے وہ صحیح ہے یا غلط۔ یہ وجہ اگر صحیح ہو بھی تو اسی وقت تک صحیح ہوسکتی ہے جب تک اس فن کی ترقی و تکمیل نہ ہو۔ جصاص کے وقت میں اگر قابل اعتماد حد تک یہ فن نہیں پہنچا تھا تو اس وقت ان کا عدم اعتماد بڑی حد تک صحیح تھا لیکن یہ کیا ضرور ہے کہ قیامت تک اسی طرح ناقابلِ اعتبار رہے؟

مزید برآں ہمیں تو اسوقت صرف یہ دکھانا ہے کہ فلکیات پر اعتماد کرنے کا نظریہ کوئی نئی بدعت نہیں جو ہم نے نکالی ہو بلکہ زمانۂ قدیم سے اس نظریہ کے حاملین چلے آرہے ہیں جس کا اعتراف جصاص کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیے :-

وقد اختلف فی معنی قول النبیؐ "فان غم علیکم فاقدروا له" فقال قائلون اراد به اعتبار منازل القمر فان کان القمر فی موضع لو لم یحل دونه سحاب وقترة رؤی یحکم بحکم الرؤیة فی الصوم والافطار وان کان علی غیر ذلک لم یحکم له بحکم الرؤیة وقال آخرون فعدوا اشعبان ثلثین یوماً۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان ۔ کہ جب مطلع غبار آلود ہو جائے تو اس کا اندازہ کرو ۔ کی تفسیر میں دو رائیں ہیں کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ اس کا مطلب ہے منازل قمر کا لحاظ کرنا یعنی اگر قمر ایسی جگہ پر واقع ہو کہ اگر ابر و غبار حائل نہ ہوتا تو وہ دکھائی دیتا تو اس پر رویت کا حکم لگایا جائے گا ۔صوم میں بھی اور عید میں بھی اور اگر یہ صورت نہ ہو تو حکم رویت نہ لگایا جائے گا ۔ دوسرے لوگ اس فرمان نبوی کا مطلب یہ بتاتے ہیں کہ اگر مطلع غبار آلود ہو تو شعبان کے تیس دن پورے کر کے روزے شروع کرو۔

جہاں تک اس ارشاد رسول کا تعلق ہے موخرالذکر گروہ کی تفسیر زیادہ صحیح[1] ہے کیونکہ دوسری کئی روایات سے اسی تفسیر کی تائید ہوتی ہے ۔ اس لحاظ سے پہلے گروہ کی تفسیر مرجوح ہے لیکن اس عبارت کو دیکھنے کے بعد اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ایک جماعت اس قول مرجوح کی بھی قائل رہی ہے جن میں مطرف ابن شخیر جیسے اجل تابعی اور امام شافعی جیسے مجتہد بھی ہیں اور یہ بھی مسلم ہے کہ ایک مرجوح قول کسی دور میں راجح بھی ہو سکتا ہے بشرطیکہ وہی انفع للناس ہو ۔ اب ہمیں اپنے دور میں دیکھنا چاہیے کہ :-

(۱) کیا فن فلکیات اس مقام پر پہنچ گیا ہے کہ اس پر اسلامی تقریبات منانے میں اعتماد کیا جا سکے ؟

(۲) اور کیا اس پر اعتماد کرنے کے بعد کوئی بڑا قومی فائدہ (مثلاً اتحاد امت اور ختم نزاع) حاصل ہونے کی توقع ہے ؟

ہم اپنی سمجھ کے مطابق وثوق کے ساتھ ان دونوں سوالوں کا جواب اثبات میں دے سکتے ہیں۔

طلوع اسلام فاضل مقالہ نگار نے زیر نظر موضوع پر حدیث اور فقہ کی رو سے بحث کی ہے ۔ ہم اس پر اتنا اضافہ ضروری سمجھتے ہیں کہ قرآن کی رو سے قمری اور شمسی دونوں طریقوں سے کیلنڈر مقرر کیا جا سکتا ہے ۔ اگر ملت کے اجتماعی مصالح کا تقاضا یہ ہو کہ شمسی مہینوں کے مطابق حساب رکھنا زیادہ منفعت بخش ہے تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں ۔ اگر کبھی اسلامی نظام قائم ہوا اور اس نے ایسا فیصلہ کر لیا تو پھر رویت ہلال کی اہمیت ہی نہیں رہے گی ۔ رفتہ رفتہ نوع انسانی سمٹ کر ایک برادری بنتی جا رہی ہے ۔ جب یہ برادری ایک خدا کے ایک قانون کے تابع آ جائے گی تو پھر حساب کتاب بھی اس طرح رکھا جائے گا جس سے ان کی وحدت مستحکم ہوتی چلی جائے ۔

---

[1] ہمیں اس سے اختلاف ہے کیونکہ فاقدروا له کے معنی اندازہ کرنے کے ہیں جو دوسری تفسیر پر چسپاں نہیں ہوتے بلکہ پہلی تفسیر پر بہتر طور پر چسپاں ہو سکتے ہیں ۔ رہی یہ چیز کہ دوسری روایات سے اسی تفسیر کی تائید ہوتی ہے تو یہ کوئی اہم نہیں ہے کیونکہ روایات زیادہ تر بالمعنیٰ نقل کی گئی ہیں جس نے جیسا کچھ سمجھا اس کا مطلب نقل کر دیا ۔ (طلوع اسلام)

تاویل اور خواب کی دنیا

[احمدیت پر زیر تصنیف کتاب کا ایک اور باب]

(از م۔ ج۔ خ)

[اس کتاب کا ایک باب جولائی ۱۹۵۴ء کے شمارہ میں مرزا صاحب اور صنف مجبور کے عنوان سے ہدیۂ ناظرین کیا جا چکا ہے زیر نظر شمارہ میں اسی کتاب کا ایک دوسرا باب پیش کیا جاتا ہے۔ (طلوع اسلام)]

دجال، یاجوج ماجوج، دوبارہ آنے والے عیسیٰ ابن مریم اور مہدی کے حالات آپ نے گذشتہ باب میں پڑھ لئے ہیں[1]۔ یہ حالات حدیث کی مستند کتب سے لئے گئے ہیں اور علماء کا دعویٰ ہے کہ یہ حالات رسول کریمؐ کی بیان کردہ پیشگوئیوں پر مبنی ہیں اور ہمارا فرض ہے کہ ان کے درست ہونے پر ایمان لائیں۔

یہ بھی دعویٰ کیا جاتا ہے کہ عرصہ سے امت کا ان پیشگوئیوں کی صحت پر اجماع رہا ہے۔ اگر امت سے مراد مولوی ہی ہیں تو مجھے اس دعوے سے اتفاق ہے۔ مولوی حقائق سے دور اپنی ایک الگ دنیا میں رہتے ہیں جہاں کسی امر کے عقل اور قیاس کے مطابق ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ صرف یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ یہ بات روایت کی کسی کتاب میں لکھی ہے، اور محدثین نے اس کو صحیح بیان کیا ہے۔ لیکن مسلمانوں کے روشن خیال پڑھے لکھے طبقہ نے ان پیشگوئیوں والی احادیث کو کبھی اہمیت نہیں دی اور نہ شعوری طور پر کبھی ان پر یقین کیا ہے۔ یہ درست ہے کہ مذہب کی نسبت سہل انگاری کی پالیسی کے تحت یہ طبقہ مولویوں کے اعتقاد کی تردید بھی نہیں کرتا کہ کون خواہ مخواہ کا جھگڑا مول لے۔ علاً اس مخمصے میں پڑنے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہی۔ طبعی علوم کی ترقی کے اس دور میں دجال اور اس سے متعلقہ کرداروں کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ خود دنیا کے مسائل نے ایسی پیچیدہ شکل اختیار کر لی ہے کہ اس طرح کے جنّاتی تصورات میں الجھنے کی کسی کو فرصت ہی نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ عرصہ سے مولویوں کے محدود دائرہ کے باہر مسلمانوں کے کسی طبقہ کو نہ ہی دجال اور جساسہ کا خوف ہے اور نہ ان فتنوں سے نجات دلانے کے لئے کسی عیسیٰ یا مہدی کے ظہور کا انتظار۔

یہ حالات تھے جب مرزا غلام احمد صاحب نے مسیح موعود اور مہدی ہونے کا دعویٰ کیا اور اپنے دعوے کی بنیاد حدیثوں میں لکھی ہوئی رسول کریمؐ کی پیشگوئیوں پر رکھی۔ یہ دور معجزات کا نہیں لیکن مرزا صاحب کے ایک اعجاز کا میں قائل ہوں کہ انہوں نے حدیث کی کتب کے کونوں کھدروں سے بھولی بسری روایات نکالیں اور اپنی مسیحیت کے زورِ قلم سے ایک مردہ مسئلے میں جان ڈال کر اسے ایک جیتی جاگتی تصویر کی شکل میں قوم کے سامنے لا کھڑا کیا۔

احادیث کے اس چیستان کو معقول صورت دینے اور اپنے آپ کو اس کا مصداق ثابت کرنے کیلئے مرزا صاحب نے جو عمل کیا "تاویل" اس کیلئے مناسب لفظ نہیں ہے کوئی دیگر موزوں لفظ نہ ہونے کی وجہ سے یہ لفظ استعمال کیا جا رہا ہے ورنہ تاویل کیلئے بھی کوئی قاعدہ، کوئی حد اور کوئی قرینہ ہونا چاہئے۔ لیکن مرزا صاحب کے متعلق معلوم یہ ہوتا ہے کہ انہوں نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ اپنے حالات کو زیر بحث احادیث کے مطابق ضرور ثابت کریں گے خواہ عبارت کا سیاق و سباق، صرف و نحو کے قواعد، عربی زبان کی لغت، تاریخ، جغرافیہ، ریاضی، قیاس اور قرینہ اس کی

---

[1] یہ باب طلوع اسلام میں شائع نہیں ہوا۔

اجازت دیں یا نہ دیں۔ اور ظاہر ہے کہ ان قیود سے آزاد ہو کر جس چیز سے جو چیز آپ کی مرضی ہو ثابت کر سکتے ہیں۔

جیسا کہ میں اس کتاب کے مقدمہ میں لکھ چکا ہوں میں نے حال ہی میں یہ پیشگوئیاں اور ان کی تاویلات کسی قدر تفصیل سے پڑھی ہیں اور میں اپنی ذاتی واقفیت کی بنا پر یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ احمدیوں کے نوجوان طبقہ میں سے بہت کم لوگوں نے مرزا صاحب کی کتب کا وہ حصہ پڑھا ہے جس میں کہ ان احادیث کی تشریح درج ہے۔ حیرت ان بزرگوں پر ہے کہ جن کے سامنے یہ تاویلیں پیش کی گئیں اور انھوں نے مان لیں۔ اور پھر حیرت خود مرزا صاحب کی جرأت اور خود اعتمادی پر ہے جس کی مدد سے انھوں نے اس بارے میں اپنی بات ایسے وثوق اور تحدی سے پیش کی کہ گویا یہ ایسا اظہر من الشمس امر ہے کہ اس کے ماننے کے سوا چارہ ہی نہیں۔

اس صورتِ حال کی ذمہ داری بہت حد تک مولویوں پر ہے۔ انھوں نے مسلمانوں کو مذہبی معاملات میں آزادیٔ فکر سے اس حد تک محروم کر دیا تھا کہ کسی کو جرأت نہ ہوتی تھی کہ کھلم کھلا دجال و ظہور مسیح کی پیشگوئیوں سے ہی انکار کر دے۔ اس سے مرزا صاحب کا کام سہل ہو گیا انھوں نے اول ان احادیث کے ظاہری معنی مسلمانوں کے سامنے رکھے اور ان کی بعید از قیاس اور خلافِ عقل تفصیلات کو ایک ایک کر کے پیش کیا اور ان سے تضحیک اور استہزا کیا۔ اس سے مقصد یہ تھا کہ غیر مولوی اور مولویوں میں سے نسبتاً آزاد خیال طبقہ اس بات کا قائل ہو جائے کہ ان پیشگوئیوں کے الفاظ کو ظاہر پر محمول کرنا درست نہیں ہے۔ اس طرزِ استدلال کی وضاحت کے لئے میں مرزا صاحب کی کتاب "ازالہ اوہام" سے ایک اقتباس پیش کرتا ہوں۔ فرماتے ہیں:۔

> مسلمانوں کے پرانے خیالات کے موافق جو ان کے دلوں میں جمے ہوئے چلے آتے ہیں یہ دعویٰ ہے کہ مسیح بن مریم رسول اللہ دو فرشتوں کے کندھوں پر ہاتھ دھرے ہوئے آسمان سے اترے گا۔ اور منارہ شرقی دمشق کے پاس آ ٹھہرے گا۔ اور بعض کہتے ہیں کہ منارہ پر اترے گا اور وہاں سے مسلمان لوگ زینہ کے ذریعہ سے اس کو نیچے اتاریں گے اور فرشتے اسی جگہ سے رخصت ہو جائیں گے اور عمدہ پوشاک پہنے ہوئے اترے گا۔ یہ نہیں کہ ننگا ہو اور پھر مہدی کے ساتھ ملاقات اور مزاج پرسی ہو گی اور باوجود اس قدر مدت گذرنے کے وہی پہلی عمر بتیس ۳۲ یا تینتیس ۳۳ برس کی ہو گی۔ اس قدر گردشِ ماہ و سال نے اس کے جسم و عمر پر کچھ اثر نہ کیا ہو گا۔ اس کے ناخن اور بال وغیرہ اس قدر سے نہ بڑھے ہوں گے جو آسمان پر اٹھائے جانے کے وقت موجود تھے اور کسی قدر تغیر اس کے وجود میں نہ آیا ہو گا۔ لیکن زمین پر اتر کر پھر سلسلہ تغیرات کا شروع ہو گا وہ کسی قسم کی جنگ و جدل نہیں کریگا بلکہ اس کے منہ کی ہوا میں ہی ایسی تاثیر ہو گی کہ جہانتک اس کی نظر پہنچے گی کافر مرتے جائیں گے۔ یعنی اس کے دم میں ہی یہ خاصیت ہو گی کہ زندوں کو مارے جیسے پہلے یہ خاصیت تھی کہ مردوں کو زندہ کرے۔ پھر ہمارے علما اپنے اس پہلے قول کو فراموش کر کے یہ دوسرا قول جو اس کا نقیض ہے پیش کرتے ہیں کہ وہ جنگ اور جدل بھی کریگا اور دجال یک چشم اس کے ہاتھ سے قتل ہو گا۔ یہودی اس کے ہاتھ سے مارے جائیں گے پھر ایک طرف تو یہ اقرار ہے کہ مسیح موعود وہی مسیح ابن مریم نبی اللہ ہے جس پر انجیل نازل ہوئی تھی جس پر حضرت جبرئیل اترا کرتا تھا۔ جو خدا تعالیٰ کے بزرگ پیغمبروں میں سے ایک پیغمبر تھا اور دوسری طرف یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ دوبارہ زمین پر آ کر نبی نبوت کا نام بھی نہیں لے گا۔ بلکہ منصب نبوت سے معزول ہو کر آئے گا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں داخل ہو کر عام مسلمانوں کی طرح شریعتِ قرآنی کا پابند ہو گا۔ نماز اوروں کے پیچھے پڑھے گا جیسے عام مسلمان پڑھا کرتے ہیں۔ بعض یہ بھی

کہتے ہیں کہ وہ حنفی ہوگا۔ امام اعظمؒ صاحب کو اپنا امام سمجھے گا مگر اب تک اس بارہ میں تصریح سے بیان نہیں کیا گیا کہ چار سلسلوں میں سے کس سلسلہ میں داخل ہوگا۔ آیا وہ قادری ہوگا یا چشتی یا سہروردی یا حضرت مجدد سرہندیؒ کی طرح نقشبندی۔ غرض ان لوگوں نے عنوان میں نبوت کا خطاب جما کر جس درجہ پر پھر اس کا تنزل کیا ہے کوئی قائم الحواس ایسا کام کبھی نہیں کر سکتا۔

پھر بعد اس کے اس کے خاص کام استعارات کو حقیقت پر حمل کر کے یہ بیان کئے گئے ہیں کہ وہ صلیب کو توڑیگا۔ خنزیروں کو قتل کریگا۔ اب جائے تعجب ہے کہ صلیب کو توڑنے سے اس کا کونسا فائدہ ہے اور اگر اس نے مثلاً دس بیس لاکھ صلیب توڑ بھی دی تو کیا عیسائی لوگ جن کو صلیب پرستی کی دھن لگی ہوئی ہے اور صلیبیں بنوا نہیں سکتے۔ اور دوسرا فقرہ جو کہا گیا ہے کہ خنزیروں کو قتل کرے گا یہ بھی اگر حقیقت پر محمول ہے تو عجیب فقرہ ہے۔ کیا حضرت مسیح کا زمین پر اترنے کے بعد عمدہ کام یہی ہوگا کہ وہ خنزیروں کا شکار کھیلتے پھریں گے اور بہت سے کتے ساتھ ہوں گے۔ اگر یہی سچ ہے تو پھر سکھوں اور چماروں اور سانسیوں اور گندھیلوں وغیرہ کو جو خنزیر کے شکار کو دوست رکھتے ہیں خوشخبری کی جگہ ہے کہ ان کی خوب بن آئے گی۔

کیا نبی اللہ کی یہی شان ہونی چاہئے کہ وہ دنیا میں اصلاحِ خلق کیلئے آئے مگر پھر اپنی اوقاتِ عزیز ایک مکروہ جانور خنزیر کے شکار میں ضائع کرے۔ . . . . . اول تو شکار کھیلنا ہی کارِ بیکاراں ہے اور اگر حضرت مسیح کو شکار ہی کی طرف رغبت ہوگی تو پھر کیا یہ پاک جانور جیسے ہرن، گورخر اور خرگوش دنیا میں کچھ کم ہیں تا ایک ناپاک جانور کے خون سے ہاتھ آلودہ کریں۔

اب میں نے وہ تمام خاکہ جو میری قوم نے مسیح کے ان سوانح کا کھینچ رکھا ہے جو دوبارہ زمین پر اترنے کے بعد ان پر گذریں گے پیش کر دیا ہے۔ عقلمند لوگ اس پر غور کریں کہ کہاں تک اس میں خلافِ قانونِ قدرت باتیں ہیں۔ کہاں تک اس میں اجتماع نقیضین موجود ہے۔ کہاں تک یہ شانِ نبوت سے بعید ہے۔

اس اقتباس کے آخری جملہ میں مرزا صاحب کی رائے سے مجھے کامل اتفاق ہے: احادیث میں بیان کردہ تصورِ نزولِ مسیح عقل اور قانونِ فطرت کے واقعی خلاف ہے۔ لیکن اس رائے کا منطقی نتیجہ یہ ہونا چاہئے تھا کہ مرزا صاحب اپنی قوم کو مشورہ دیتے کہ یہ احادیث موضوع ہیں اور رد کرنے کے لائق ہیں۔ ایسی باتوں کو خبرِ رسولؐ کا درجہ کیونکر دیا جا سکتا ہے۔ آؤ ہم ان فرسودہ قصوں کو چھوڑیں اور اس کتاب کو مضبوطی سے پکڑیں جو یقینی طور پر خدا نے بھیجی ہے۔ جس کی حفاظت کا وہ خود ضامن ہے۔ جس میں تمام ہدایت آگئی ہے اور جس کی کسی بات میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔

اگر مرزا صاحب ایسا کرتے اور اس تبلیغ پر اپنا زورِ بیان صرف کرتے تو خواہ وہ اپنی الگ جماعت بنانے میں کامیاب ہوتے یا نہ، میں انھیں دورِ حاضر کا بہت بڑا مصلح اور مجددِ دین مان لیتا۔ لیکن ان کی غرض فاسد عقائد کی اصلاح نہ تھی۔ بلکہ یہ تھی کہ کسی طرح اپنے دعوئے نبوت و مجددیت کی تائید رسولِ کریم کی پیشگوئیوں سے کی جائے۔ ظاہر ہے کہ اس مقصد کے پیشِ نظر وہ ان احادیث کو رد نہ کر سکتے تھے۔ اس لئے احادیث کے مضمون پر مخالفانہ تنقید اور تضحیک کے ساتھ ہی انھوں نے بار بار اس بات پر زور دیا ہے کہ یہ روایات غلط نہیں ہو سکتیں۔ مثلاً اگر کوئی حدیث صحیح بخاری میں درج ہے تو اس بات کو خاص طور سے نمایاں کیا ہے کہ بخاری اصح الکتب بعد کتاب اللہ ہے۔ لیکن اگر کوئی روایت صحیحین میں

نہیں آئی لیکن اس سے اپنے دعوے کی نسبت کسی تاویل کے ذریعہ استمداد کی جا سکتی ہے تو پھر مرزا صاحب نے اس امر کا ذکر نہیں کیا کہ بخاری اور مسلم میں یہ حدیث نہیں آئی۔ اس صورت میں انھوں نے صرف یہ کہنے پر اکتفا کر دیا ہے کہ یہ روایت صحاح ستہ میں درج ہے۔ اس کے ساتھ ہی احادیث کے معانی وہ کئے ہیں جن کے متحمل نہ الفاظ ہوتے ہیں اور نہ ہی کوئی قرائن اس طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اس کے باوجود مرزا صاحب کو بہت مشکل کام درپیش تھا۔ روایات اتنی متناقض اور متضاد تھیں کہ تمام تاویلات کے باوجود مرزا صاحب ان میں کوئی قابلِ قبول تطابق پیدا نہیں کر سکے۔ بلکہ اس کوشش میں خود مرزا صاحب کی کتب اور اکثر ایک ہی کتاب کے مختلف حصص میں بین تضاد واقع ہو گیا ہے اور مجھے حیرت ہے کہ ان کی اربان کے مریدوں کی اس طرف توجہ کیوں نہیں ہوئی۔

مثال کے طور پر دجال اور مسیح ابن مریمؑ کی نسبت سب سے لمبی حدیث نواس بن سمعان سے مروی ہے۔ اس میں دجال کی شخصیت اور اس کے سوانح کی نسبت اتنی تفصیل سے خبر دی گئی ہے کہ مرزا صاحب کے لئے یہ مشکل ہو گیا کہ اس کی مکمل تاویل اپنے زمانہ کے حالات کے مطابق کریں۔ ویسے دجال کی نسبت مرزا صاحب کو چنداں دلچسپی نہ تھی۔ لیکن احادیث میں ظہورِ مسیح دجال کے زمانہ کے ساتھ وابستہ کر دیا گیا ہے اور مسیح کے اہم کاموں میں دجال کے ساتھ مقابلہ اور اس کو قتل کرنا شامل ہیں۔ اس لئے مرزا صاحب کیلئے یہ ضروری ہو گیا کہ دجال کے قصہ کی نسبت کوئی نہ کوئی توجیہ پیش کریں۔

ازالہ اوہام میں پہلے تو مرزا صاحب نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ نواس بن سمعان کی حدیث ہی موضوع اور قابلِ رد ہے۔ کم از کم اس حدیث میں جو خروجِ دجال کی نسبت پیشگوئی ہے اس کے متعلق مرزا صاحب کی رائے یہی معلوم ہوتی ہے کہ یہ آخری زمانہ کی نسبت نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ رسولِ کریمؐ کے خیال کے مطابق دجال سے مراد ایک شخص ابن صیاد ہے جو نبیؐ کے زمانہ میں موجود تھا۔ اس نظریہ کے حق میں مرزا صاحب نے اپنے دلائل ان الفاظ میں بیان کئے ہیں:۔

> یہ (نواس بن سمعان والی) وہ حدیث ہے جو صحیح مسلم میں امام مسلم صاحب نے لکھی ہے جس کو ضعیف سمجھ کر رئیس المحدثین امام محمد اسمٰعیل بخاری نے چھوڑ دیا ہے۔ اس جگہ حیرانی کا یہ مقام ہے کہ جو کچھ دجال کے حالات و صفات اس حدیث میں لکھے گئے ہیں اور جس طرز سے اس کے آنے کی خبر بتائی گئی ہے یہ بیان دوسری حدیثوں کے بیان سے بالکل منافی اور مبائن اور مخالف پایا جاتا ہے۔ کیونکہ صحیحین میں یہ حدیث بھی ہے کہ محمد بن منکدر تابعی سے روایت ہے کہ کہا کہ میں نے جابر بن عبداللہ کو دیکھا کہ خدا تعالیٰ کی قسم کھاتا تھا کہ ابنِ صیاد ہی دجالِ معہود ہے۔ اور محمد بن منکدر کہتا ہے کہ میں نے جابر کو کہا کہ کیا تو خدا تعالیٰ کی قسم کھاتا ہے؟ یعنی یہ امر تو ظنی ہے نہ یقینی۔ پھر قسم کیوں کھاتا ہے۔ جابرؓ نے کہا کہ میں نے عمرؓ کو بحضور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس بارہ میں قسم کھاتے سنا یعنی عمر رضی اللہ عنہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو قسم کھا کر کہا کرتا تھا کہ ابنِ صیاد ہی دجالِ معہود ہے۔
>
> پھر ایک دوسری حدیث یہ بھی ہے کہ نافع سے روایت ہے کہ ابنِ عمر کہتے تھے کہ مجھے قسم ہے اللہ کی کہ میں ابن صیاد کے مسیحِ دجال ہونے میں شک نہیں کرتا۔
>
> اب جبکہ خاص صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے بیان سے ثابت ہو گیا کہ ابنِ صیاد ہی دجالِ معہود ہے بلکہ صحابہ نے قسمیں کھا کر کہا کہ یہی

دجالِ معہود ہے تو کیا اس کے دجال ہونے میں کچھ شک رہ گیا ہے؟

یہ کیسا عجیب معاملہ ہے کہ بعض صحابہ قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ ابن صیادہی دجال ہے اور صحیحین میں بروایت جابر لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ کے قسم کھانے پر کہ دجال معہود یہی شخص ہے خاموشی اختیار کرکے اپنی رائے ظاہر کر دی کہ درحقیقت دجالِ معہود ابن صیادہی تھا اور صحیح مسلم میں ابنِ صیاد کا مشرف بہ اسلام ہونا اور صاحب اولاد ہونا اور مکہ و مدینہ میں جانا بوضاحت تمام لکھا ہے۔ اب ہر ایک منصف بنظرِ انصاف دیکھ سکتا ہے کہ جن کتابوں میں دجال کے آخری زمانے میں ظاہر ہونے اور حضرت عیسیٰؑ کے ہاتھ سے مارے جانے کی خبر لکھی ہے انھیں کتابوں میں یہ لکھا ہوا بھی موجود ہے کہ دجال معہود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہی ظاہر ہوگیا تھا اور مشرف بہ اسلام ہو کر فوت ہوگیا تھا اور اس کا مشرف بہ اسلام ہونا بھی زرّئے اس پیشگوئی کے ضروری تھا جو بخاری اور مسلم میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے بہ پیرایہ ایک خواب کے بیان ہو چکی ہے۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو عالمِ رویا میں خانہ کعبہ کا طواف کرتے دیکھا تھا۔ بہرحال جبکہ انھیں حدیثوں میں دجال معہود کا اس طرح پر فیصلہ کیا گیا ہے تو پھر دوسری حدیثوں پر جو ان کی ضد واقع ہیں کیونکر اعتبار کیا جائے۔

اس عبارت سے ظاہر ہو گیا کہ مرزا صاحب اس مسلک کے بالکل قریب پہنچ گئے ہیں کہ دجال والی پیشگوئی کو مکمل طور سے رد کر دینا چاہیئے۔ بلکہ ایک جگہ تو وہ دونوں نظریات یعنی یہ کہ دجال آخری زمانے میں ظاہر ہوگا یا یہ کہ ابنِ صیادہی دجال ہے سے انکار کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اور یہ رائے پیش کرتے ہیں کہ اگر ان دو متضاد مضامین والی احادیث کی تطبیق کرنا ممکن نہیں (جو کہ فی الواقع کسی معقول طریق پر ممکن نہیں ہے) تو اصول "اذا تعارضا تساقطا" پر عمل کرکے دونوں قسم کی حدیثوں کو ساقط از اعتبار کرنا چاہیئے"۔

لیکن مرزا صاحب مکمل طور پر اس مسلک کو نہیں اپناتے۔ کیونکہ اس صورت میں ان کے اپنے دعوے کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی۔ اگر دجال کی نسبت احادیث کو رد کر دیا جائے تو عیسیٰ علیہ السلام (یا ان کے مثیل) کے ظہور کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ ذکر انہی احادیث کا جزو ہے۔ اسلئے مرزا صاحب نے یہ "راہِ اعتدال" اختیار کی ہے کہ پیش گوئی کے جس حصہ کی کوئی تاویل ممکن ہے اس کی تاویل کی جائے خواہ وہ معقولیت سے کتنی ہی عاری ہو۔ لیکن جو حصے ایسے رہ جاتے ہیں جن کی تاویل مرزا صاحب کے لئے اپنے تمام فن کو بروئے کار لانے کے بعد بھی ممکن نہیں ان حصوں کو تضحیک کا نشانہ بنایا جائے اور رد کر دیا جائے۔

اب میں اس تاویل کے چند نمونے پیش کرتا ہوں اور اس بات کا فیصلہ کہ مرزا صاحب اس مہم میں کس حد تک کامیاب ہوئے ہیں قارئین پر چھوڑتا ہوں۔

شاید سب سے دلچسپ بات دمشق کی نسبت ہے۔ بظاہر خیال گذرے گا کہ دمشق ایک خاص شہر کا نام ہے اس میں تاویل کی ضرورت کیا ہے اور گنجائش کہاں ہے۔ لیکن آپ مرزا صاحب کا استدلال ملاحظہ کریں۔ "آئینہ کمالاتِ اسلام" میں علماء کو مخاطب کرکے فرماتے ہیں۔ (اصل عبارت عربی میں ہے اس کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے):-

ان کو یہ خبر کہاں سے ملی ہے اور یہ کس دلیل پر یقین رکھتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ اس دمشق میں نازل ہوں گے جو ملک شام کا قاعدہ دار الخلافہ ہے؟

کیا رسول کریمؐ ان علماء کے ہمراہ دمشق تک گئے ہیں اور وہاں جا کر ان کو وہ منارہ اور موضع نزولِ مسیح دکھایا ہے۔ یا کیا حضورؐ نے اس مقام کا نقشہ کاغذ پر بنا کر ان کو دکھایا ہے جس سے یہ جگہ ان کے ذہن نشین ہو گئی ہے اور اب وہ اس سے انکار نہیں کرتے اور پھر کیا اس شہر کو حرمین اور دیگر شہروں پر کوئی فضیلت حاصل ہے اور اس شہر کے رہنے والے سب پاکباز لوگ ہیں؟ اور چاہئے کہ ان کو اس بات سے دھوکہ نہ ہو کہ احادیث میں لفظ 'دمشق' آیا ہے۔ یہ تو ایک عام مفہوم والا لفظ ہے اور اس کے کئی معانی ہیں جن کو کہ اہلِ علم لوگ اچھی طرح جانتے ہیں۔ ان معانی میں سے ایک خاص شہر کا نام ہے۔ اسی طرح یہ لفظ نسلِ کنعان کی ایک قوم کے سردار کیلئے بھی استعمال ہوا ہے اور ناقہ اور جمل بھی اس کے معنی ہیں۔ اور یہ لفظ مرد چابک دست کے معنی میں بھی بولا جاتا ہے۔ ان کے علاوہ اس کے کئی اور معنی بھی ہیں۔ پس اس خاص معنی (یعنی شہر کے نام) میں کیا خاص بات ہے کہ علماء اس پر اصرار کرتے ہیں اور دیگر معانی سے اعراض کرتے ہیں۔

یہاں مرزا صاحب نے یہ ظاہر نہیں کیا کہ آخر اتنے بہت سے معانی میں سے حدیث میں یہ لفظ کس خاص معنی میں استعمال ہوا ہے۔ آخر اگر رسول کریمؐ نے یہ لفظ استعمال کیا ہے اور فرمایا ہے کہ "مسیح ابن مریمؑ نازل ہوگا دمشق کے مشرق میں منارۃ البیضاء کے پاس" تو دمشق سے مراد اُن کی کیا تھی۔ شام کا شہر، کسی قوم کا سردار، ناقہ، جمل، ہوشیار آدمی یا کچھ اور؟ اور پھر اس خاص اور درست معنی کے لحاظ سے سیاق اور سباق کے دیگر الفاظ کے کیا معانی ہیں؟ دمشق کے "مشرق" سے کیا مراد ہے؟ منارۃ البیضاء کا کیا مفہوم ہے؟ اور اس کے پاس نازل ہونے سے کیا مطلب ہے؟ اس موقع پر ان سب سوالات میں سے صرف ایک اور لفظ یعنی 'منارہ' کا انھوں نے ذکر کیا ہے۔ کہتے ہیں:

اسی طرح لفظ منارہ ہے جو حدیث میں آیا ہے۔ اس سے مراد موضعِ نور ہوتا ہے۔ اور کبھی یہ لفظ اس نشان کی نسبت بولا جاتا ہے جس سے لوگ راستہ معلوم کرتے ہیں۔ پس یہ اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ آنے والا مسیح ان انوار سے پہچانا جائے گا جو اس کے دعوے سے پہلے آئیں گے اور نشان اور عَلَم کا کام دیں گے تاکہ لوگ اس تک اپنی راہ پا لیویں۔

مرزا صاحب نے اپنی ایک دوسری تصنیف "ازالہ اوہام" میں دمشق کے معاملے پر مزید روشنی ڈالی ہے جیسا کہ کتاب کا نام ظاہر کرتا ہے مرزا صاحب نے کوشش کی ہے کہ مسئلہ بالکل صاف ہو جائے اور کوئی شبہات باقی نہ رہ جائیں۔ یہ اور بات ہے کہ ان کا طرزِ استدلال بہت کم لوگوں کی سمجھ میں آسکے گا۔ یہاں انھوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ حدیث میں لفظِ دمشق سے مراد نہ تو شام کا دارالخلافہ ہے اور نہ ہی وہ دوسرے معانی ہیں جن کا ذکر 'آئینہ کمالاتِ اسلام' والی عبارت میں ہے۔ بلکہ اصل میں دمشق کے معنی قادیان کا قصبہ ہے۔ اس بارے میں مرزا صاحب کی دلیل ان کے اپنے الفاظ میں حسب ذیل ہے:۔

پس واضح ہو کہ دمشق کے لفظ کی تعبیر میں میرے پر منجانب اللہ یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ اس جگہ ایسے قصبہ کا نام دمشق رکھا گیا ہے۔ جس میں ایسے لوگ رہتے ہیں جو یزید الطبع اور یزید پلید کی عادات اور خیالات کے پیرو ہیں۔ جن کے دلوں میں اللہ اور رسول کی کچھ محبت نہیں اور احکامِ الٰہی کی کچھ عظمت نہیں۔ جنھوں نے اپنی نفسانی خواہشوں کو اپنا معبود بنا رکھا ہے اور اپنے نفسِ امارہ کے حکموں کے ایسے مطیع ہیں کہ مقدسوں اور پاکوں کا خون بھی ان کی نظر میں سہل اور آسان امر ہے اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور خدا تعالیٰ کا موجود ہونا ان کی نگاہ میں ایک پیچیدہ

مسئلہ ہے جو انھیں سمجھ میں نہیں آتا۔ اور چونکہ طبیب کو بیماروں ہی کی طرف آنا چاہئے اس لئے ضرور تھا کہ مسیح ایسے لوگوں میں ہی نازل ہو۔ غرض مجھ پر یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ دمشق کے لفظ سے دراصل وہ مقام مراد ہے جس میں دمشق والی مشہور خاصیت پائی جاتی ہو اور خدا تعالیٰ نے مسیح کے اترنے کی جگہ جو دمشق کو بیان کیا۔ تو یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ مسیح سے مراد وہ اصلی مسیح نہیں جس پر انجیل نازل ہوئی تھی بلکہ مسلمانوں میں سے کوئی ایسا شخص مراد ہے جو اپنی روحانی حالت کی رو سے مسیح سے اور نیز امام حسین سے بھی مشابہت رکھتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔

کیونکہ دمشق پایۂ تخت یزید ہو چکا ہے اور یزیدیوں کا منصوبہ گاہ۔ جس سے ہزارہا طرح کے ظالمانہ احکام نافذ ہوئے وہ دمشق ہی ہے اور یزیدیوں کو ان یہودیوں سے بہت مشابہت ہے جو حضرت مسیحؑ کے وقت میں تھے اور ایسا ہی حضرت امام حسینؓ کو اپنی مظلومانہ زندگی کی رو سے حضرت مسیحؑ سے غایت درجہ کی مماثلت ہے۔

آگے چل کر مرزا صاحب نے اس پیچیدہ مماثلت اور استعارہ پر مزید بحث کی ہے جس کا مکمل طور پر نقل کرنا طوالت کا موجب ہوگا۔ بالآخر مرزا صاحب اس حیرت انگیز نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ نزول مسیح والی حدیث میں دمشق کے لفظ سے مراد قادیان ہے۔ لیکن اس بارے میں اپنے استدلال کی کمزوری کو محسوس کرتے ہوئے انھوں نے الہام کا بھی سہارا لیا ہے چنانچہ لکھتے ہیں:

اس بارے میں قادیان کی نسبت مجھے یہ بھی الہام ہوا کہ اخرج منہ الیزیدیون یعنی اس میں یزیدی لوگ پیدا کئے گئے ہیں۔

یہ امر قابلِ غور ہے کہ ایک کتاب میں تو مرزا صاحب شام کے شہر دمشق کو موضع نزولِ مسیح ملنے سے اس وجہ سے انکار کرتے ہیں کہ اس شہر کو دیگر شہروں بالخصوص مکہ و مدینہ پر فضیلت دینے کی کوئی وجہ نہیں ہے اور کہ اس شہر کے سب لوگ پاکباز نہیں ہیں لیکن دوسری کتاب میں اس کے بالکل برعکس یہ رائے پیش کرتے ہیں کہ نزول مسیح کے لئے مناسب قیام وہ شہر ہوگا جس کے باشندے اپنی بدطینتی میں نمایاں حیثیت رکھتے ہوں۔

الہام سے قطع نظر مرزا صاحب نے قادیان کے لوگوں کی نسبت وہ خاص باتیں ہمیں نہیں بتائیں جن کی بنیاد پر وہ ان کے لئے "یزیدیوں" کا عجیب و غریب لقب تجویز فرماتے ہیں۔ جہاں تک ہمیں علم ہے اس بارے میں بھی قادیان کو پنجاب کی دیگر آبادیوں پر کوئی شرف حاصل نہیں ہے۔

تاویل کے لئے مرزا صاحب نے اس پر اکتفا نہیں کیا بلکہ دعویٰ کیا ہے کہ انھیں اس سے بھی زیادہ واضح الہام اور کشف کے ذریعہ اطلاع دی گئی ہے کہ مسیح موعود نے قادیان میں پیدا ہونا تھا اور کہ دمشق سے مراد قادیان ہی ہے۔ اول الہام کو لیجئے۔ فرماتے ہیں:-

یہ بھی مدت سے الہام ہو چکا ہے کہ "انا انزلناہ قریباً من القادیان وبالحق انزلناہ وبالحق نزل وکان وعد اللہ مفعولا" یعنی ہم نے اس کو قادیان کے قریب اتارا ہے اور سچائی کے ساتھ اتارا ہے اور سچائی کے ساتھ اترا اور ایک دن وعدہ اللہ کا پورا ہونا تھا۔ اس الہام پر نظر کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ قادیان میں خدا تعالیٰ کی طرف سے اس عاجز کا ظاہر ہونا الہامی نوشتوں میں بطور پیشگوئی کے پہلے سے لکھا گیا تھا۔ اب چونکہ قادیان کو اپنی ایک خاصیت کی رو سے دمشق سے مشابہت دی گئی تو اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ قادیان کا نام پہلے نوشتوں میں استعارہ کے طور پر دمشق رکھ کر پیشگوئی بیان کی گئی ہوگی کیونکہ کسی کتاب حدیث یا قرآن شریف میں قادیان کا نام لکھا ہوا نہیں پایا جاتا اور یہ الہام جو براہین احمدیہ میں بھی چھپ چکا ہے بصراحت و بآواز بلند ظاہر کر رہا ہے کہ قادیان کا نام قرآن شریف میں یا احادیثِ نبویہ میں بطور پیشگوئی ضرور موجود ہے اور چونکہ موجود نہیں تو بجز اس کے اور کس طرف خیال جا سکتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے

قادیان کا نام قرآن شریف یا احادیث نبویہ میں کسی اور پیرایہ میں ضرور لکھا ہوگا اور اب جو ایک نئے الہام سے یہ بات بپایۂ ثبوت پہنچ گئی کہ قادیان کو خدا تعالیٰ کے نزدیک دمشق سے مشابہت ہے تو اس پہلے الہام کے معنی بھی اس سے کھل گئے گویا یہ فقرہ جو اللہ جل شانہٗ نے الہام کے طور پر اس عاجز کے دل پر القا کیا ہے کہ انا انزلناہ قریبا من القادیان اس کی تفسیر یہ ہے کہ انا انزلناہ قریبا من دمشق بطرف شرقی عند المنارۃ البیضاء۔ کیونکہ اس عاجز کی سکونتی جگہ قادیان کے شرقی کنارہ پر ہے، منارہ کے پاس۔

(یہاں یہ بتا دینا مناسب ہوگا کہ یہ منارہ مرزا صاحب نے خود تعمیر کرایا تھا اور ظاہر ہے کہ حدیث کے الفاظ کو ملحوظ رکھتے ہوئے وہیں بنایا جانا بنانا چاہیے تھا یعنی اپنے مکان کے پاس اس سے مغرب کی طرف) اگر یہ تحریر میں نے اصل کتاب میں نہ پڑھی ہوتی تو مجھے کبھی یقین نہ آتا کہ اس قسم کی دلیل کوئی آدمی کسی سنجیدہ موضوع کی بحث میں پیش کر سکتا ہے۔ میرے لئے اس پر کسی طرح کی تنقید کرنا بھی مشکل ہو گیا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کس جزو سے شروع کروں اور کس کس پہلو کی نسبت لکھوں اور کیا لکھوں۔ خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا کہئے!

میں تو بار بار سوچنے کے بعد بھی اپنے ذہن میں اس استدلال کا کوئی مربوط سلسلہ قائم کرنے سے ہی قاصر ہوں۔ آخر حضرت مسیح کے مصلوب نہ کیے جانے، یہود کے مظالم اور امام حسین علیہ السلام کی شہادت، یزید کی حکومت کا پایۂ تخت، ان سب باتوں کا آپس میں کیا تعلق ہے؟ اور اگر کھینچ تان کر ان سب باتوں کو کسی طرح جوڑ دیا جائے تو پھر اس قصے میں پنجاب کا گاؤں قادیان کیسے داخل ہو جائے گا؟

سابقہ حوالہ سے ظاہر ہوگا کہ مرزا صاحب کو اس بارے میں ایک الجھن یہ بھی تھی کہ ان کے الہام کے مطابق سابقہ پیشگوئیوں میں مسیح کے قادیان میں نازل یا پیدا ہونے کی بشارت ہونی چاہیے لیکن ان کے اپنے الفاظ میں صورت یہ ہے کہ "کسی کتاب حدیث یا قرآن شریف میں قادیان کا نام لکھا ہوا نہیں پایا جاتا" لیکن بالآخر یہ کھوئی ہوئی کڑی بھی مرزا صاحب کے ایک کشف نے مہیا کر دی اور ان کو اس معاملہ میں پورا اطمینان ہو گیا۔ فرماتے ہیں:

> اس جگہ مجھے یاد آیا ہے کہ جس روز وہ الہام مذکورہ بالا جس میں قادیان میں نازل ہونے کا ذکر ہے ہوا تھا اس روز کشفی طور پر میں نے دیکھا کہ میرے بھائی صاحب مرحوم مرزا غلام قادر میرے قریب بیٹھ کر آواز بلند قرآن شریف پڑھ رہے ہیں اور پڑھتے پڑھتے انھوں نے ان فقرات کو پڑھا کہ انا انزلناہ قریبا من القادیان۔ تو میں نے سن کر بہت تعجب کیا کہ کیا قادیان کا نام بھی قرآن شریف میں لکھا ہوا ہے۔ تب انھوں نے کہا کہ یہ دیکھو لکھا ہوا ہے۔ تب میں نے نظر ڈال کر جو دیکھا تو معلوم ہوا کہ فی الحقیقت قرآن شریف کے دائیں صفحہ میں شاید قریب نصف کے موقعہ پر یہی الہامی عبارت لکھی ہوئی موجود ہے۔ تب میں نے اپنے دل میں کہا کہ ہاں واقعی طور پر قادیان کا نام قرآن شریف میں درج ہے اور میں نے کہا کہ تین شہروں کا نام اعزاز کے ساتھ قرآن شریف میں درج کیا گیا ہے۔ مکہ اور مدینہ اور قادیان۔

خواب اور کشف کی ماہیت کی نسبت میں اپنے خیالات اس کتاب میں ایک دوسرے مقام پر پیش کروں گا۔ فی الحال براہِ راست زیر بحث معاملہ کیلئے اتنا کہہ دینا ہی کافی ہے کہ مرزا صاحب کے کہنے کے مطابق ان کے سامنے سوال یہ تھا کہ آیا قرآن اور حدیث میں قادیان کا نام درج ہے یا نہیں۔ یہ ایک واقعاتی امر ہے جس کا فیصلہ ان کتابوں کے مطالعہ سے ہو سکتا ہے۔ خواب یا کشف کا اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔

ایک ضمنی سی لیکن دلچسپ بات یہ بھی بیان کئے دیتا ہوں کہ کشف کی بنا پر تو مرزا صاحب قادیان کو تقدس دیکر مکہ اور مدینہ کا

ہمسر بنا رہے ہیں۔ لیکن اس سے پہلے اپنے ہی ایک الہام کی بنا پر اسی قادیان کو یزیدی صفت لوگوں کے پیدا ہونے کی جگہ بتایا ہے اور اس وجہ سے اس شہر کو دمشق سے مشابہت دی ہے۔

معلوم یہ ہوتا ہے کہ ان تمام براہینِ قاطع کے استعمال کے بعد بھی مرزا صاحب کو پورا اعتماد نہیں ہوا کہ ان کے مخاطب لوگ ان کی تاویلات اور توجیہات پر ایمان لے آئیں گے اسلئے مذبذب لوگوں کی تسلی کے لئے انھوں نے ایک اور صورت بھی پیش کی ہے۔ اور وہ یہ کہ فی الحال تو قادیان کو دمشق سمجھ کر مجھ پر ایمان لے آؤ۔ ہو سکتا ہے کہ بعد میں اصل دمشق میں کوئی دوسرا مسیح نازل ہو جائے اس وقت دیکھا جائے گا۔ یہ گنجائش مرزا صاحب نے ان الفاظ میں ظاہر کی ہے:۔

> اب اگرچہ میرا یہ دعوےٰ تو نہیں اور نہ ایسے کامل تصریح سے خدا تعالیٰ نے میرے پر کھولا ہے کہ دمشق میں کوئی مثیلِ مسیح پیدا نہیں ہوگا بلکہ میرے نزدیک ممکن ہے کہ کسی آئندہ زمانہ میں خاص کر دمشق میں بھی کوئی مثیلِ مسیح پیدا ہو جائے مگر خدا تعالیٰ خوب جانتا ہے اور وہ اس بات کا شاہدِ حال ہے کہ اس نے قادیان کو دمشق سے مشابہت دی ہے۔

اب مختصراً اس موضوع پر مرزا صاحب کی چند مزید تصریحات کا ذکر کیا جاتا ہے۔ اس کتاب کے محدود مقصد کیلئے تمام تاویلات کا ذکر کرنا غیر ضروری ہے اور اس کیلئے وقت اور گنجائش بھی نہیں۔ اور بہرحال جو لوگ دمشق کی نسبت مرزا صاحب کی تاویل کو قابلِ قبول سمجھتے ہیں ان کیلئے دیگر توجیہات پر ایمان ایمان لے آنا بھی چنداں مشکل نہ ہوگا۔

تخیل کو سب سے زیادہ کام میں لانے کی ضرورت مرزا صاحب کو لفظ 'دجال' کی تشریح میں پیش آئی ہے۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے۔ اول تو مرزا صاحب نے یہ نظریہ پیش کیا کہ آخری زمانے میں کسی دجال کے خروج کا خیال ہی غلط ہے اور عقلی اور نقلی دونوں لحاظ سے ثابت نہیں۔ حیرت ہے کہ اس نظریہ کے باوجود مرزا صاحب دجال کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے اور بالآخر بڑی تحقیق کے بعد یہ خیال پیش کیا کہ دجال سے مراد ایک فردِ واحد نہیں ہے بلکہ حدیث میں یہ لفظ ایک تمثیلی رنگ میں استعمال ہوا ہے اور اس نام سے مقصد ایک قوم کی خاصیت کو ظاہر کرنا ہے۔ اپنے موضوع کی مناسبت کے لحاظ سے مرزا صاحب نے بعض جگہ تو دجال سے مراد انگریز قوم لی ہے اور بعض جگہ پادریوں کا گروہ۔ مرزا صاحب کے لئے اپنے دعوئ مسیحیت کو درست ثابت کرنے کیلئے کسی نہ کسی دجال کو پیش کرنا ضروری تھا اسلئے جہاں حدیث میں مذکورہ دجال مافوق العادت کارناموں کا ذکر کیا ہے وہاں اس سے مراد انگریز قوم لی ہے اور جہاں دجال کا مسلمانوں اور مسیح سے مقابلے کا ذکر آیا ہے وہاں اس کو عیسائی پادریوں سے مخصوص کر دیا ہے۔ اس ضمن میں اپنی حاجت کا ذکر بھی مرزا صاحب نے کھلم کھلا کر دیا ہے۔ ازالہ اوہام میں لکھتے ہیں:۔

> اس عاجز کے مسیح موعود ہونے پر یہ نشان ہے کہ مسیح موعود کے ظہور کی خصوصیت کے ساتھ یہ علامت ہے کہ دجال معہود کے خروج کے بعد نازل ہوگا۔ کیونکہ یہ ایک واقعہ مسلمہ ہے کہ دجال معہود کے خروج کے بعد آنے والا وہی سچا مسیح ہے جو مسیح موعود کے نام سے موسوم ہے اور ضرور ہے کہ وہ دجال معہود کے بعد نازل ہو۔ سو یہ عاجز دجال معہود کے خروج کے بعد آیا ہے۔ پس اس میں کچھ شک نہیں کہ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ دجال معہود یہی پادریوں اور عیسائی قوموں کا گروہ ہے جس نے زمین کو اپنے ساحرانہ کارناموں سے تہ و بالا کر دیا ہے۔ اور جو ٹھیک ٹھیک اس وقت سے زور کے ساتھ خروج کر رہا ہے تو ساتھ ہی اس عاجز کا مسیح موعود ہونا بھی ثابت ہو جائے گا۔

اس صورت کے پیش نظر مرزا صاحب نے پورا زور اس بات پر صرف کیا ہے کہ کسی طرح ثابت ہو جائے کہ دجال کی تمام نشانیاں انگریزوں میں موجود ہیں (اس بحث میں مرزا صاحب نے اکثر انگریزوں اور پادریوں کے ذکر کو آپس میں خلط ملط کر دیا ہے) مرزا صاحب لکھتے ہیں کہ

دجال کے اعور یعنی ایک آنکھ سے کانا ہونے سے یہ مراد ہے کہ دینی اور دنیوی علوم کہ دونوں آنکھوں میں سے اس قوم کی ایک آنکھ روشن ہوگی اور دوسری ناکارہ۔ اور یہ ظاہر ہے کہ افرنگ کو زمینی علوم میں نہایت درجہ کی مہارت حاصل ہے لیکن روحانیات سے بالکل بے بہرہ ہیں۔

اس ضمن میں مرزا صاحب دو تین باتوں کو نظر انداز کر گئے ہیں۔ حدیث میں اللہ کے اعور نہ ہونے سے کیا مراد ہے؟ کیا خدا تعالیٰ کی نسبت دینی یا دنیاوی علوم میں مہارت ہونے یا نہ ہونے کے سوال کا تصور بھی ہو سکتا ہے؟ پھر حدیث کے الفاظ کے مطابق رسول اللہ نے صحابہ کو عور کی نسبت کسی شبہ میں نہیں چھوڑا۔ انھوں نے فرمایا کہ دجال کی ایک آنکھ انگور کے ابھرے ہوئے دانہ کی مانند ہوگی۔ اور ساتھ نمونہ بھی بتا دیا کہ ابن قطن کو دیکھ لو بس دجال کی آنکھ اس کی آنکھ کی طرح ہوگی۔

دجال کے گدھے پر سوار ہو کر آنے کی نسبت مرزا صاحب کی دریافت یہ ہے کہ اس سے مراد ریل گاڑی ہے جو انگریزوں نے ایجاد کی ہے۔ گدھے کے کانوں کے درمیان ۷۰ باع (قریباً ۱۴۰ گز) فاصلہ ہونے سے گاڑی کی لمبائی کی طرف اشارہ ہے (گویا گدھے کے کانوں سے مراد اس کا سر اور دم ہے!)۔

حدیث میں گدھے کا رنگ بھی دیا ہے اور لکھا ہے کہ وہ سفید براق ہوگا۔ اس کی تشریح مرزا صاحب نے ضروری خیال نہیں کی۔ میں نے بڑے غور کے بعد فیصلہ کیا ہے کہ غالباً اس سے مراد گدھے کے نگہبان یعنی ریل کے گارڈ ہوں گے جن کی وردی عام طور پر سفید ہوتی ہے۔

تفنن برطرف، میرے لئے اس ضمن میں مزید کچھ کہنا ممکن نہیں۔ قارئین اصل حدیث کے متن کی طرف دوبارہ رجوع کریں اور پھر دیکھیں کہ وہ عبارت بحیثیت مجموعی اس طرح کی تاویلات کی اجازت دیتی ہے جو مرزا صاحب پیش کر رہے ہیں۔ یہ بھی تو خیال کرنا چاہئے کہ روایات کے مطابق رسول کریمؐ کے اولیں مخاطب آپ کے الفاظ کے کیا معنی سمجھتے تھے۔ اس کا تو ایک ہی جواب ہے کہ وہ لوگ الفاظ کو ان کے ظاہر معانی پر ہی محمول کر رہے تھے اور اسی مفہوم کو ملحوظ رکھ کر اپنے ہر طرح کے شبہات دور کر رہے تھے۔ مثلاً جب انھیں بتایا گیا کہ دجال کے وقت میں بعض دن ایک سال کے برابر بھی ہوں گے تو انھیں نمازوں کے اوقات کا فکر لاحق ہو گیا اور انھوں نے اس بارے میں استفسار کیا۔ اگر رسول کریم مجاز اور استعارہ کے رنگ میں گفتگو کر رہے ہوتے تو یقینی طور پر ان کا جواب وہ نہیں ہو سکتا تھا جو حدیث میں درج ہے۔ حدیث کے مطابق آپ نے فرمایا کہ نمازوں کیلئے تم اس لمبے دن کو اندازے کے مطابق مختلف حصوں میں تقسیم کر لینا اور اس طرح نمازیں ادا کرنا۔

سنجیدہ کلام کا اولیں مقصد مخاطب کو اپنا مافی الضمیر سمجھانا ہوتا ہے نہ کہ اس کو گمراہ کیا جائے۔ کیا رسول کریم کا منصب یہ تھا کہ مستقبل کی نسبت پیشگوئی کرتے اور وہ ایک مسلسل پہیلی ہوتی اور امت کا کوئی آدمی اس کا درست مطلب نہ پا سکتا۔

تاویل کی ایک اور مثال پیش کر کے اس ذکر کو ختم کرنا چاہتا ہوں۔ حدیث میں ہے کہ نزول کے وقت حضرت مسیح دو رنگدار (زعفرانی) چادروں میں ملبوس ہوں گے اور اپنے ہاتھ فرشتوں کے کندھوں پر رکھے ہوئے ہوں گے۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے مرزا صاحب نے احادیث میں بیان کی ہوئی سب تفاصیل کی تاویل نہیں کی بلکہ بہت سی باتوں کو نظر انداز کر دیا ہے۔ نہ معلوم چادروں کے معاملہ کی وضاحت انھوں نے کیوں

ضروری خیال کی۔ زعفرانی چادر میں ملبوس ہونے کی نسبت مرزا صاحب کا انکشاف یہ ہے کہ اس سے مراد مرزا صاحب کی دو بیماریاں یعنی دردِ سر اور ذیابیطس ہیں جو کہ انھیں اوائل سے ہی لاحق تھیں۔ اس تاویل کی مزید توجیہ یہ کی گئی ہے کہ خواب کی تعبیر کے علم میں زرد کپڑے سے مراد بیماری ہوتی ہے۔ مجھے علم تعبیر میں کوئی دسترس حاصل نہیں ہے۔ اس لئے نہیں کہہ سکتا کہ یہ رائے کہاں تک درست ہے۔ لیکن مرزا صاحب نے ہمیں یہ نہیں بتایا کہ وہ کس کے خواب کی تعبیر کر رہے ہیں۔ حدیث میں تو کسی خواب کا ذکر ہی نہیں۔

احادیث کی تاویل میں جو آزادی مرزا صاحب نے اپنے لئے جائز قرار دی ہے اپنے الہامات کی تعبیر میں بھی اس سے پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ مثال کے طور پر اپنی کتاب 'اربعین' میں مرزا صاحب نے اپنے چند الہامات درج کئے ہیں جو ان کے کہنے کے مطابق اس کتاب کی تصنیف سے بیس سال پہلے کے ہیں اور مرزا صاحب کی پہلی کتاب 'براہین احمدیہ' میں چھپ چکے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس اثنا میں بعض علما نے مرزا صاحب کے دعاوی کی بنا پر ان کے خلاف کفر کے فتوے لگا دیئے تھے۔ مرزا صاحب کی تحریر سے ظاہر ہوتا ہے کہ تکفیر کی اس مہم میں مولوی نذیر حسین صاحب دہلوی اور مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی پیش پیش تھے۔ 'اربعین' میں مرزا صاحب نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان دونوں صاحبان کی طرف سے ان کی مخالفت کرنے اور اس کے نتائج کی نسبت 'براہین احمدیہ' میں مندرج الہامات بصورتِ پیشگوئی کے ہیں۔ اور ان کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے مرزا صاحب کو پہلے سے خبر دے دی تھی کہ مولویوں کی طرف سے کفر کے فتاوی تیار کئے جائیں گے۔ ان پر دوسرے علما کے دستخط کرائے جائیں گے اور پھر ان کی تشہیر کی جائے گی۔

دیکھنا یہ ہے کہ 'براہین احمدیہ' کی الہامی عبارت کہاں تک ان معانی اور تاویلات کی متحمل ہو سکتی ہے جو کہ مرزا صاحب نے 'اربعین' میں بیان کئے ہیں۔ متعلقہ الہامات عربی میں ہیں۔ میں پہلے ان کا متن اور لفظی ترجمہ پیش کرتا ہوں:۔

اذا یمکربک الذی کفر، اوقد لی یاھامان، لعلی اطلع علی الٰہ موسیٰ وانی لاظنہ من الکاذبین۔ تبت یدا ابی لھب وتب۔ ماکان لہ ان یدخل فیھا الا خائفاً وما اصابک فمن اللہ، الفتنۃ ھھنا فاصبر کما صبر اولوا العزم۔

(اور جب تیرے ساتھ مکر کیا اس شخص نے جس نے کفر کی راہ اختیار کی۔ اے ہامان میرے لئے آگ روشن کر۔ شاید کہ میں موسیٰ کے معبود کی اطلاع پا سکوں اور میں تو اس کو جھوٹوں میں سے خیال کرتا ہوں۔ ٹوٹ گئے ہاتھ ابی لہب کے اور ٹوٹ گیا وہ خود۔ اس کیلئے نہیں چاہیئے تھا کہ داخل ہو اس میں مگر اس حالت میں کہ وہ خائف ہو اور جو تکلیف تجھ کو پہنچی ہے پس یہ اللہ کی طرف سے ہے۔ یہ فتنہ ہے پس صبر کر جیسا کہ صبر کیا اولوالعزم لوگوں نے)

اب اسی عبارت کا وہ ترجمہ اور تفسیر ملاحظہ ہو۔ جو مرزا صاحب نے بیان کی ہے 'تفسیر' کا لفظ میں اپنی طرف سے لکھ رہا ہوں ورنہ مرزا صاحب نے تو صرف 'ترجمہ' لکھ کر مضمون شروع کر دیا ہے جس سے غیر عربی دان قارئین پر یہ اثر ہو سکتا ہے کہ یہ اصل عبارت کا محض ترجمہ ہی بیان ہو رہا ہے۔ بہرحال مرزا صاحب کی بیان کردہ تشریح ان کے اپنے الفاظ میں یہ ہے:

"ترجمہ ۔ ۔ ۔ ۔ اور یاد کر وہ وقت جب تیرے پر ایک شخص سراسر مکر سے تکفیر کا فتویٰ دیگا (یہ ایک پیشگوئی ہے جس میں ایک بدقسمت مولوی کی نسبت خبر دی گئی ہے کہ ایک زمانہ آتا ہے جب کہ وہ مسیح موعود کی نسبت تکفیر کا کاغذ طیار کرے گا) اور پھر فرمایا کہ وہ اپنے بزرگ ہامان کو کہے گا کہ اس تکفیر کی بنیاد توڑ ڈال کہ یہ اثر لوگوں پر بہت ہے اور تو اپنے فتوے سے سب کو اقروختہ کر سکتا ہے۔ سو تو سب سے پہلے اس

کفر نامہ پر مہر لگا۔ تا سب علما بھڑک اٹھیں اور تیری مہر کو دیکھکر وہ بھی مہر لگا دیں اور تا کہ میں دیکھوں کہ خدا اس شخص کے ساتھ ہے یا نہیں۔ کیونکہ میں اس کو جھوٹا سمجھتا ہوں (تب اس نے مہر لگا دی) ابولہب ہلاک ہو گیا اور اس کے دونوں ہاتھ ہلاک ہو گئے۔ (ایک وہ ہاتھ جس کے ساتھ تکفیر نامہ کو پکڑا اور دوسرا وہ ہاتھ جس کے ساتھ مہر لگائی یا تکفیر نامہ لکھا) اس کو نہیں چاہئے تھا کہ اس کام میں دخل دیتا مگر ڈرتے ڈرتے اور جو تجھے رنج پہنچے گا وہ تو خدا کی طرف سے ہے۔ جب وہ ہامان تکفیر نامہ پر مہر لگا دے گا تو بڑا فتنہ برپا ہوگا۔ پس تو صبر کر جیسا کہ اولوالعزم نبیوں نے صبر کیا۔ یہ اشارہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نسبت ہے کہ ان پر بھی یہود کے پلید طبع مولویوں نے کفر کا فتویٰ لکھا تھا اور اس الہام میں یہ اشارہ ہے کہ یہ تکفیر اسلئے ہوگی کہ تا اس امر میں بھی حضرت عیسیٰؑ سے مشابہت پیدا ہو جائے۔ اور اس الہام میں خدا تعالیٰ نے استفتا لکھنے والے کا نام فرعون رکھا اور فتویٰ دینے والے کا نام جس نے اول فتویٰ دیا ہامان۔ پس تعجب نہیں کہ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ ہامان اپنے کفر پر مرے گا لیکن فرعون کسی وقت جب خدا کا ارادہ ہو سکے گا "آمنت بالذی آمنت بہ بنوا اسرائیل"

اصل الفاظ پھر پڑھئے اور اس طویل ترجمہ اور تاویل کا ان سے مقابلہ کیجئے۔ یہ فیصلہ میں آپ پر ہی چھوڑتا ہوں کہ بیان کردہ الہامات سے اس طرح کے معانی لینے میں مرزا صاحب کہاں تک حق بجانب ہیں۔ اس ضمن میں یہ بھی یاد رہے کہ مرزا صاحب کو اعتراف ہے کہ خود الہامی عبارت 'براہین احمدیہ' میں اس ترتیب سے نہیں لکھی ہوئی جس میں کہ مرزا صاحب نے ایک خاص مضمون کے ثبوت کیلئے اسے اربعین میں درج کیا۔ وہ یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ الہامات کے یہ ٹکڑے مرزا صاحب کی ہی دوسری کتب میں مختلف ترتیبوں سے لکھے جا چکے ہیں لیکن وہ اس میں کوئی قباحت خیال نہیں کرتے۔ اس بارے میں ان کی پوزیشن یہ ہے:-

چونکہ کئی دفعہ کئی ترتیبوں کے رنگ میں یہ الہامات ہو چکے ہیں۔ اسلئے فقرات کے جوڑنے میں ایک خاص ترتیب کا لحاظ نہیں۔ ہر ایک ترتیب فہم ملہم کے مطابق الہامی ہے۔

یہ امر مرزا صاحب نے آسانی سے نظر انداز کر دیا ہے کہ جن الہامات پر وہ انحصار کر رہے ہیں ان کا بیشتر حصہ قرآن کی آیات ہیں اور اگر فہم کے مطابق ان کی ترتیب مقرر ہوئی ہے تو اصل ملہم نے مرزا صاحب کے زمانہ سے بہت پہلے اس عبارت کو ترتیب دیدی ہے (اور یہ بھی شکر ہے کہ ایک ہی ترتیب قرار پائی ہے اور وہ اب تک قائم ہے۔)

مرزا صاحب نے یہ بیان نہیں فرمایا کہ کب پہلی بار ان کے اپنے ذہن میں الہامات کے وہ معنی آئے جو انھوں نے ۱۹۰۰ء میں اربعین کے ذریعہ لوگوں کے سامنے پیش کئے۔ قیاس یہی ہے کہ مرزا صاحب کو یہ معانی تکفیر کے فتووں کے بعد سوجھے ہیں۔

غضب یہ ہے کہ الہامات کے ان معانی کو جو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ آ سکتے تھے مرزا صاحب اپنے مخالفین کیلئے حجت قرار دیتے ہیں۔ مثلاً اسی کتاب اربعین میں ایک دوسرے مقام پر عربی کی ایک لمبی عبارت لکھی ہے اور اس کے متعلق دعوےٰ کیا ہے کہ یہ ان کے وہ الہام ہیں جو بہت عرصہ پہلے براہین احمدیہ میں چھپ چکے ہیں۔ مرزا صاحب کے کہنے کے مطابق براہین کی اشاعت کے وقت ان کے حریف علما مثلاً مولوی محمد حسین وغیرہ نے بڑے تعریفی الفاظ میں ریویو کیا تھا۔ اسلئے اب یہ علما مرزا صاحب کی مخالفت کرنے میں حق بجانب نہیں ہیں۔

سابقہ عبارت کی طرح ان الہامات کے بعض حصے بھی قرآنی آیات کے ٹکڑے ہیں۔ لیکن جس نئی "الہامی ترتیب" سے مرزا صاحب نے لکھے ہیں اس سے بالکل بے جوڑ اور مبہم ہو گئے ہیں۔ بہرحال اس عبارت کا ایک حصہ نقل کر کے اول اس کا لفظی ترجمہ لکھتا ہوں اور پھر مرزا صاحب کا استدلال پیش کیا جائے گا۔

اردت ان استخلف فخلقت آدم یا آدم اسکن انت وزوجك الجنة یا احمد اسکن انت وزوجك الجنة یا مریم اسکن انت وزوجك الجنة تموت وانا راض منك فادخلوا الجنة انشاء الله امنين، سلام عليكم طبتم فادخلوها امنين ..... خلق آدم فاكرمه جرى الله فى حلل الانبياء ..... سلام على ابراهيم صافيناه ونجيناه من الغم تفرد نابذ لك فاتخذ وا من مقام ابراهيم مصلى۔

[ترجمہ: میں نے ارادہ کیا کہ اپنا خلیفہ بناؤں۔ پس میں نے آدم کو پیدا کیا۔ اے آدم تو اور تیری بیوی جنت میں رہو۔ اے احمد تو اور تیری بیوی جنت میں رہو۔ اے مریم تو اور تیرا زوج جنت میں رہو۔ تو مرے گا اور میں تجھ سے راضی ہونگا۔ پس داخل ہو جنت میں انشاء اللہ امن کے ساتھ۔ تم پر سلام ہو۔ تم نے اچھے کام کئے پس داخل ہو اس میں امن کے ساتھ ..... اس نے آدم کو پیدا کیا اور اس کو بزرگی دی۔ اللہ کا جری انبیاء کے لباس میں ..... سلام ہو ابراہیم پر ہم نے اس سے محبت کی (؟) اس کو غم سے نجات دی۔ ہم نے ہی یہ کیا (؟) پس مقام ابراہیم سے جائے نماز بناؤ۔]

اب اسی عبارت کا مرزا صاحب کا اپنا کیا ہوا ترجمہ اور اس پر ان کا استدلال و بزعم خود اتمام حجت ملاحظہ ہو۔ لکھتے ہیں:۔

ترجمہ ..... میں نے ارادہ کیا کہ ایک خلیفہ پیدا کروں۔ سو میں نے آدم کو بنایا۔ اے آدم تو اور تیرے دوست اور تیری بیوی بہشت میں داخل ہو۔ اے احمد تو اور تیرے دوست اور تیری بیوی بہشت میں داخل ہو۔ اے مریم تو اور تیرے دوست اور تیری عورت بہشت میں داخل ہو۔ تو اس حالت میں مرے گا کہ میں تجھ سے راضی ہوں گا اور خدا کے فضل سے تو بہشت میں داخل ہوگا۔ سلامتی کے ساتھ، پاکیزگی کے ساتھ، امن کے ساتھ بہشت میں داخل ہوگا ..... اس نے اس آدم کو یعنی تجھ کو پیدا کیا اور اسکو عزت دی۔ یہ خدا کا رسول ہے نبیوں کے حلوں میں ..... ابراہیم پر سلام (یعنی اس عاجز پر) ہم نے اس سے محبت کی اور غم سے نجات دی۔ ہم نے ہی یہ کیا۔ پس تم ابراہیم کے قدم پر چلو۔

اس جگہ تک وہ عبارت ہے جو مرزا صاحب نے عربی الہامات کے ترجمہ کے طور پر پیش کی ہے عربی زبان سے معمولی واقفیت رکھنے والے اصحاب بھی جان سکتے ہیں کہ محض ترجمہ میں ہی کس قدر تحریف کی گئی ہے۔ اپنی طرف سے مضمون بڑھا دیا گیا ہے اور بالکل بے بنیاد تاویل سے کام لیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو کہ کس طرح تین دفعہ "اور تیرے دوست" کے الفاظ بغیر وجہ کے ترجمہ میں شامل کر لئے گئے ہیں اور پھر بغیر کسی قرینہ کے آدم اور ابراہیم کے ساتھ "یعنی تجھ کو" اور "یعنی اس عاجز کو" زیادہ کر کے اس عبارت کا مخاطب اپنے آپ کو قرار دیدیا ہے اور اس تصرف کیلئے کوئی عذر بھی پیش نہیں کیا گیا۔ یہ امر بھی دلچسپ ہے کہ الہامی عبارت کو مکمل طور پر اپنی ذات سے وابستہ کرنے کے شوق میں مرزا صاحب نے زوج مریم کا ترجمہ بھی "مریم کی بیوی" کر دیا ہے۔

محولہ بالا "ترجمہ" پیش کرنے کے بعد اور اسی کی بنا پر مرزا صاحب اپنے مخالف علماء پر حجت قائم کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان علماء کو کیونکر زیب دیتا ہے کہ میری مخالفت کرتے ہیں۔ حالانکہ

یہ وہ الہامات براہین احمدیہ ہیں جن کا مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی نے ریویو لکھا تھا اور جن کو پنجاب اور ہندوستان کے تمام نامی علماء نے قبول کر لیا تھا۔ اور ان پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ حالانکہ ان الہامات کے کئی مقامات میں اس خاکسار پر خدا تعالیٰ کی طرف سے صلوٰۃ اور سلام ہے اور یہ الہامات اگر میری طرف سے اس موقع پر ظاہر ہوتے جب کہ علماء مخالف ہو گئے تھے تو وہ لوگ ہزارہا اعتراض کرتے۔ لیکن وہ ایسے موقع پر شائع کئے گئے جبکہ یہ علماء میرے موافق تھے . . . . . اور سوچنے سے ظاہر ہو گا کہ میرے دعوائے مسیح ہونے کی بنیاد انہی الہامات سے پڑی ہے . . . . اگر علماء کو خبر ہوتی کہ ان الہامات سے تو اس شخص کا مسیح ہونا ثابت ہوتا ہے تو وہ کبھی ان کو قبول نہ کرتے۔ یہ خدا کی قدرت ہے کہ انھوں نے قبول کر لیا اور اس پیچ میں پھنس گئے۔

یہاں چند امور قابلِ غور ہیں:-

۱- براہین احمدیہ میں مرزا صاحب نے مذکورہ الہامات کے ساتھ اس امر کی تصریح کر دی تھی کہ ان میں مندرجہ تعریفی کلمات فی الحقیقت رسول کریمؐ کی ذات کے متعلق ہیں چنانچہ لکھتے ہیں:-

اور ان کلمات کا حاصل مطلب تلطفات اور برکاتِ الٰہیہ ہیں جو حضرت خیر الرسل کی متابعت کی برکت سے ہر ایک کامل مومن کے شاملِ حال ہو جاتی ہیں اور حقیقی طور پر مصداق ان سب عنایات کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور دوسرے سب طفیلی ہیں اور اس بات کو ہر جگہ یاد رکھنا چاہئے کہ ہر ایک مدح و ثنا جو کسی مومن کی الہامات میں کی جائے وہ حقیقی طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح ہوتی ہے۔

۲- براہین احمدیہ کی اشاعت کے وقت اور اس کے کئی سال بعد تک مرزا صاحب نے اپنی نسبت مجدد، مسیح یا مہدی ہونے کا کوئی دعویٰ نہیں کیا تھا۔ بلکہ دوسرے مسلمانوں کی طرح مسیح کے جسمانی نزول کے قائل اور منتظر تھے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:-

اور جس غلبۂ کاملۂ دینِ اسلام کا وعدہ دیا گیا ہے وہ غلبۂ مسیح کے ذریعہ سے ظہور میں آئیگا اور جب حضرت مسیح علیہ السلام دوبارہ اس دنیا میں تشریف لائیں گے تو ان کے ہاتھ سے دینِ اسلام جمیع آفاق اور اقطار میں پھیل جائے گا۔

یہ بحث کہ کیونکر بعد میں مرزا صاحب نے اپنا عقیدہ تبدیل کر لیا اور یہ دعویٰ کر دیا کہ وہ خود مسیح موعود ہیں ایک الگ موضوع ہے۔ یہاں صرف اس امر کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے کہ جن الہامات کے ذریعہ خود ملہم پر اپنے مسیح ہونے کا راز نہ کھل سکا ان پر مولوی محمد حسین صاحب کیونکر اس بنا پر اعتراض کرتے کہ "ان الہامات سے تو اس شخص کا مسیح ہونا ثابت ہوتا ہے"؟

[نوٹ: یہ امور مرزا صاحب کے مخالف مولوی صاحبان کے نقطۂ نگاہ کے مطابق لکھے گئے ہیں۔ میں اپنے عقائد مختلف ہیں۔ میں قرآن کے بعد کسی شکل میں الہام کا قائل نہیں ہوں اور اپنی اس رائے کو عقیدۂ ختمِ نبوت کا لازمی اور ناقابلِ استثنیٰ منطقی نتیجہ سمجھتا ہوں۔ اس موضوع پر اس کتاب کے ایک علیحدہ باب میں مفصل بحث کی گئی ہے۔]

تاویل کی ایک اور مثال پیش کر کے اس باب کو ختم کرتا ہوں۔ تحریر کے یہ چند نمونے مرزا صاحب کا رجحانِ طبع اور طرزِ استدلال سامنے لانے کیلئے درج کئے گئے ہیں۔ اگر ناظرین کو اس معاملہ میں زیادہ دلچسپی ہو تو مرزا صاحب کی اصل کتب پڑھیں ان میں جگہ جگہ بعید از قیاس تاویلات اور ناقابلِ فہم استدلال کے نمونے ملیں گے۔

معلوم ہوتا ہے کہ مرزا صاحب نے تہیہ کر لیا تھا کہ کسی بات کے سیدھے سادے معنی نہ کریں گے اور حتی الوسع ہر مضمون سے کوئی نئی اور عجیب و غریب بات پیدا کرنے کی کوشش کریں گے۔ اس رویہ کے وہ اس قدر عادی ہو گئے تھے کہ انھوں نے اپنے حق میں حقیر سے فائدہ کے لئے ہر طرح کی تحریف و تاویل کو جائز قرار دے لیا۔ اس قسم کے رجحان کا ایک نفسیاتی اثر یہ ہوتا ہے کہ کچھ عرصہ کی مشق کے بعد انسان کو اس طرح کی نکتہ آفرینی میں لطف آنے لگتا ہے اور وہ اس سے الگ ہو کر سوچ ہی نہیں سکتا۔

کتاب 'اربعین' جیسا کہ اس کا نام ظاہر کرتا ہے مرزا صاحب نے اس ارادہ کے ساتھ لکھنی شروع کی تھی کہ اس میں اپنی صداقت پر چالیس دلائل پیش کریں گے۔ شروع میں مرزا صاحب کا خیال کتاب کو چالیس قسطوں میں شائع کرنے کا تھا۔ چنانچہ کتاب کے پہلے حصہ یعنی اربعین نمبر ۱ کے شروع میں مرزا صاحب نے کتاب کی نسبت یہ ہدایت لکھی:

نصیحت: وہ تمام دوست جن کے پاس وقتاً فوقتاً یہ نمبر پہنچے جائیں چاہئے کہ وہ ان کو جمع کرتے جائیں اور پھر ترتیب وار ایک رسالہ کی صورت میں بنالیں اور اس رسالہ کا نام ہوگا: 'اربعین لاتمام الحجۃ علی المخالفین'۔

آج میں نے اتمام حجت کیلئے یہ ارادہ کیا ہے کہ مخالفین اور منکرین کی دعوت میں چالیس اشتہار شائع کروں تا قیامت کو میری طرف سے حضرت احدیت میں یہ حجت ہو کہ میں جس امر کیلئے بھیجا گیا تھا اس کو میں نے پورا کیا۔

اپنے اس ارادہ کی مزید تشریح مرزا صاحب نے کتاب کے حاشیہ میں اس طرح کی ہے:

اس اشتہار کے بعد انشاء اللہ ہر ایک اشتہار پندرہ پندرہ دن کے بعد بشرطیکہ کوئی روک پیش نہ آجائے نکلا کرے گا۔ جب تک کہ چالیس اشتہار پورے ہو جائیں۔

بعد میں چار اشتہار یا رسالے لکھنے پر مرزا صاحب نے کتاب ختم کر دی اور چالیس اشتہار پورا کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اس میں کوئی خاص بات نہ تھی۔ مصنفوں کی بہتر کوشش کے باوجود بعض کتب نامکمل رہ جاتی ہیں۔ بہرحال یہ ایک معمولی سا معاملہ تھا اور معذرت کے چند الفاظ لکھ دینا کافی تھا۔ لیکن نہ معلوم اپنے فن کے تقاضہ سے مجبور ہو کر یا مخالف مولویوں کے اعتراض کے ڈر سے مرزا صاحب نے اس امر کیلئے بھی سند تلاش کر کے پیش کر دی ہے۔ یہ کہنے کے بعد کہ رسالے توقع سے زیادہ لمبے ہو گئے ہیں لکھتے ہیں کہ:

درحقیقت وہ امر پورا ہو چکا جس کا میں نے ارادہ کیا تھا۔ اسلئے میں نے ان رسائل کو صرف چار نمبر تک ختم کر دیا اور آئندہ شائع نہیں ہوگا جس طرح ہمارے خدائے عزوجل نے اول پچاس نمازیں فرض کیں پھر تخفیف کر کے پانچ کو بجائے پچاس کے قرار دیا۔ اسی طرح میں بھی اپنے رب کریم کی سنت پر ناظرین کی تخفیفِ تصدیع کر کے چار کو بجائے نمبر چالیس کے قرار دیتا ہوں۔

بزمِ طلوعِ اسلام ڈھاکہ

کا آفس ۵۴ کیپٹن بازار ڈھاکہ میں قائم ہو چکا ہے۔ جو حضرات ڈھاکہ میں تحریک طلوعِ اسلام سے متعلق ہیں وہ خود کو اس سے منسلک کر سکتے ہیں جو تقویتِ تحریک اور باہمی تعارف کیلئے مفید ہوگا۔

لغتِ عربی کی تدوین

از علامہ محترم احمد امین:۔

استاذ کلیۃ الآداب بالجامعۃ المصریہ

طلوع اسلام کے ناظرین سے یہ امر پوشیدہ نہیں کہ قرآن کریم کی تفسیر میں ہمارا اپنا ایک خاص طریقہ ہے جس سے ہم نے خود بھی قرآن کو سمجھا ہے اور ناظرین کو بھی اسی طریقہ سے سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں اور وہ طریقہ ہے قرآن کی تفسیر خود قرآن کریم سے یعنی جو حروفات اور الفاظ و کلمات قرآن کریم میں آئے ہیں ان کے معانی کی تحدید و تعیین خود قرآن کریم سے کرنے کی کوشش کی جائے۔ قرآن کریم نے تصریفِ آیات اور الفاظ کو مختلف طریقوں سے استعمال کرکے اپنے معانی خود ہی واضح کر دیئے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ طریقہ نہایت محفوظ اور یقینی ہے، جس میں شک و شبہ کی کوئی ذرا سی گنجائش بھی باقی نہیں رہتی۔ لیکن ہمارے علماء کرام اس طرزِ تفسیر نگاری پر برابر اعتراضات کرتے رہتے ہیں۔ ان حضرات کا طریقہ قرآن کی تفسیر روایات و احادیث سے کرنے کا ہے۔ دوسرے درجہ میں یہ حضرات لغت سے استفادہ کرتے ہیں۔ تفسیر بالروایت کے متعلق طلوع اسلام کے صفحات پر اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ مزید کچھ لکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہی (مقام حدیث میں یہ تمام مضامین یکجا شائع کر دیئے گئے ہیں)۔ زیر نظر مضمون علامہ احمد امین استاذ کلیۃ الآداب جامعہ مصریہ کی شہرۂ آفاق کتاب "ضحی الاسلام" جلد دوم کے اس باب کا ترجمہ ہے جس میں موصوف نے لغتِ عربیہ کی تدوین پر تاریخی حیثیت سے روشنی ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ وہ کس طرح مدون کیا گیا اور کس حد تک قابلِ اعتماد اور لائقِ وثوق ہے۔

اس بحث سے لغتِ عربی کی اہمیت کو کم کرنا ہرگز مقصود نہیں ہے بلکہ صرف اتنا مقصد ہے کہ ہمیں ہر چیز کی اصلیت اور پوزیشن کو سمجھ لینا چاہئے تاکہ ہم اسے اس مقام پر رکھ سکیں جس کی وہ اہل ہے۔ نہ ہم اس کو اس کے مقام سے بہت اونچا لیجائیں اور نہ ہی بہت فروتر۔

گر فرقِ مراتب نہ کنی زندیقی　　　　(طلوع اسلام)

جزیرۂ عرب اور اطراف جزیرہ اہل عرب کا مسکن تھا، قبائلی معیشت کے مطابق زندگی بسر کرتے تھے اور لغت کے اعتبار سے ان قبائل میں اختلاف تھا۔

یہ اختلاف کبھی تو کلمات کا اختلاف ہوتا تھا۔ ایک قبیلہ گیہوں کیلئے لفظ "بُرٌّ" استعمال کرتا تھا تو دوسرا قبیلہ "قَمْحٌ" استعمال کرتا تھا۔ عدنانی قبائل بادشاہ کے لئے "مَلِكٌ" کا لفظ بولتے تھے تو اہل حمیر اسی معنی کے لئے "قَيْلٌ" کا لفظ بولتے تھے۔

کبھی کلمہ تو ایک ہوتا تھا لیکن مختلف قبائل اسے مختلف معانی میں استعمال کرتے تھے جیسا کہ "وَثَبَ" کا مادہ ہے۔ حجازی قبائل اسے

فتحمندی کے معنی میں بولتے تھے اور یمانی قبائل اسے بالکل ہی مخالف معنی میں استعمال کرتے تھے چنانچہ ان کے ہاں ثِبْ کے معنی ہوتے تھے "بیٹھ جا" چنانچہ مؤلف سے روایت ہے کہ عامر بن الطفیلؓ رسول اللہ صلعم کی خدمت میں حاضر ہوئے فَوَثَّبَہٗ وِسَادَۃً جس کے معنی ہیں کہ آپ نے ان کیلئے ایک گدا بچھایا اور اس پر ان کو بٹھایا۔ اَلْوِثَابُ لغت حمیر میں بچھونے کو کہتے ہیں۔ ان کے ہاں بادشاہ کو مَوْثَبَانٌ کہتے ہیں کیونکہ وہ دیر تک بیٹھا رہتا ہے۔ اور بذاتِ خود لڑائیوں میں شریک نہیں ہوتا ——— کہتے ہیں کہ کوئی حجازی کسی حمیری بادشاہ کے دربار میں حاضر ہوا۔ بادشاہ نے اس سے کہا "ثِبْ" تو اس حجازی نے اچھلنا کودنا شروع کر دیا حالانکہ بادشاہ کا مقصد یہ تھا کہ "تم بیٹھ جاؤ" اس پر بادشاہ نے یہ فرمان جاری کر دیا کہ مَنْ دَخَلَ ظَفَارِ حَمَّرَ (ظفار یمن کا ایک شہر ہے) یعنی جو شخص شہر ظفار میں داخل ہو اُسے پہلے حمیری زبان سیکھ لینی چاہیئے۔

کبھی حرکات میں اختلاف ہوا کرتا تھا چنانچہ بعض قبائل مثل قریش وغیرہ حروف مضارع کو مفتوح (زبر سے) بولتے تھے چنانچہ نَسْتَعِیْنُ کہتے تھے اور بعض قبائل مثلاً اسد وغیرہ اس کو مکسور (زیر سے) بولتے تھے اور نِسْتَعِیْنُ کہتے تھے۔

ایسے ہی اختلاف کی بہت سی صورتیں تھیں چنانچہ بعض قبائل اُولٰئِكَ (یہ لوگ) کہتے تھے اور بعض قبائل اسی کو اُولَالِكَ کہتے تھے۔ بعض قبائل اِسْتَحْیَیْتُ (مجھے شرم آگئی) بولتے تھے تو دوسرے قبائل اسی کو اِسْتَحَیْتُ بولتے تھے۔ بعض قبائل مُسْتَهْزِءُوْنَ (مذاق اڑانے والے) بولتے تھے تو کچھ دوسرے قبائل مُسْتَهْزُوْنَ کہتے تھے۔ بعض قبائل قَضٰی (اس نے فیصلہ کر دیا) رَمٰی (اس نے تیر پھینکا) بولتے تھے تو دوسرے قبائل اسی کو قَضِیْ رَمِیْ بولتے تھے۔ بعض قبائل مَا زَیْدٌ قَائِمٌ (زید کھڑا نہیں ہے) بولتے تھے تو دوسرے قبائل مَا زَیْدٌ قَائِمًا کہتے تھے۔ بعض قبائل هَلُمُّوْا اِلَیْنَا (سب ہماری طرف آجاؤ) کہتے تھے مگر دوسرے قبائل واحد تثنیہ اور جمع تینوں صورتوں میں هَلُمَّ اِلَیْنَا بولتے تھے۔ بعض قبائل بجلی کو صَاعِقَةٌ کہتے تھے مگر دوسرے قبیلے صَاقِعَةٌ کہتے تھے۔ بعض قبائل هٰذِهِ الْبَقَرُ وَهٰذِهِ النَّخْلُ (تانیث کے ساتھ) بولتے تھے تو دوسرے قبائل هٰذَا الْبَقَرُ وَهٰذَا النَّخْلُ (مذکر) بولتے تھے۔ چنانچہ ایسے اختلافات کی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔

قبائل کا یہ اختلاف بعض اوقات نہایت شدید اور عظیم ہوتا تھا جیسا کہ حجاز میں قبائل عدنانیہ اور یمن میں قبائل قحطانیہ کے اختلافات ہیں کہ یہ اختلافات خود مفردات اور تراکیب کے اختلافات بن جاتے تھے۔ حتیٰ کہ ابو عمرو ابن العلاء نے تو کہہ دیا کہ حمیر اور یمن کے دور دراز علاقوں کی زبان نہ ہماری زبان ہے اور نہ ان کی عربیت ہماری عربیت ہے۔ ابن جنیؒ نے کہا ہے کہ ہمیں اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قبیلۂ حمیر کا لغت اور ان کی گرامر، اولادِ نزار کی لغت سے بہت ہی مختلف ہے۔ میں ایک دن ابو علیؒ کی خدمت میں حاضر ہوا تو وہ کہنے لگے کہ تم کئی دن سے کہاں تھے؟ میں تو تمہیں ڈھونڈ رہا ہوں۔ میں نے کہا کیا بات ہے؟ کہنے لگے کہ اہل عرب کے اس قول "ہِنْ خُوَدِیْتٍ[1]" کے بارہ میں تم کیا جانتے ہو۔ ہم دونوں نے ملکر بہت کچھ کاوش کی مگر کوئی بات نہ پیدا کر سکے۔ ابو علی نے بتایا کہ یہ یمن کا لغت ہے اور اولادِ نزار کے لغت کے خلاف ہے۔ لہٰذا کوئی عجب نہیں کہ یہ لفظ ان کی مثالوں کے خلاف ان کے ہاں مستعمل ہو۔

---

[1] خودیت ایک جگہ کا نام ہے جس کی نظیر موجود نہیں ہے۔ ابو علی اس لفظ کا وزن تلاش کرنا چاہتے تھے کہ اس وزن پر عربی میں کوئی دوسرا لفظ مل جائے کیونکہ یہ وزن عربی میں نادر الاستعمال ہے۔

لیکن کبھی قبائل کا یہ اختلاف معمولی ہوا کرتا تھا جیسے ان دو قبیلوں کا اختلاف جن کی اصل ایک ہی ہو اور آس پاس کے علاقوں میں سکونت پذیر ہوں۔

اس اختلاف کے بعض نتائج بھی تھے۔ ان ہی نتائج میں سے قرآن میں اختلافِ قرأت بھی تھا چنانچہ قرآنِ کریم عرب کے مختلف لغات اور لہجوں کے مطابق مختلف طریقہ پر پڑھا جانے لگا۔ ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ قرآن سات لغتوں میں اترا ہے[1]۔ جن میں سے پانچ ہوازن کے لغات ہیں جنھیں علیا ہوازن کہا جاتا ہے۔ یہ پانچ یا چار قبیلے ہیں۔ ان میں سعد بن بکر، جشم بن بکر، نصر بن معاویہ، اور ثقیف شامل ہیں۔ قرآن کی قرأتوں کو اس حیثیت سے پڑھا جا سکتا ہے یعنی یہ قرأتیں عرب کے مختلف قبائل کے لغات اور لہجوں کی نمائندگی کرتی ہیں۔

لغتِ عرب میں کثرتِ مرادفات کا اہم ترین سبب یہ قبائلی اختلافات ہی تھے۔ بعض قبائل ایک چیز کا ایک نام رکھتے تھے اور دوسرا قبیلہ دوسرا نام رکھتا تھا جس کی مثالیں موجود ہیں۔ مثلاً شُکُرؔ (شکر) کو لغتِ یمن میں بِلِبُرتُ کہتے تھے۔

اس بنا پر عجیب کثرت کے ساتھ مرادفات پیدا ہوتے چلے گئے چنانچہ کہتے ہیں کہ شہد کے لئے عربی میں اسّی اسم ہیں۔ تلوار کے لئے پچاس اسم ہیں، حتیٰ کہ صاحب قاموس نے اس موضوع پر ایک مستقل کتاب لکھی ہے جس کا نام "الروض المسلوف فیما لہٗ اسمان الی الوف" ہے۔ اس کثرتِ مرادفات سے فوائد بھی ہوئے اور نقصانات بھی۔ شعراء کو یہ سہولت ہو گئی کہ قافیہ اور ردی کی پابندی کے ساتھ وہ طویل سے طویل قصائد نظم کرتے چلے جاتے تھے جو ان مترادفات کی عدم موجودگی میں اتنا سہل نہیں تھا۔ ساتھ ہی یہ کاتبوں اور منشیوں کی بلاغت اور فصحاء کی فصاحت کا ایک عمدہ ذریعہ ثابت ہوا کہ وہ سجع اور ترصیع کے لئے مترادف الفاظ میں سے مناسب الفاظ انتخاب کر سکتے اور قوی موقعوں کے لئے قوی کلمات کو اور نرم موقعوں کے لئے نرم الفاظ کو منتخب کر سکتے تھے۔ لیکن دوسری طرف اس کثرتِ مترادفات نے لغت کو اس قدر ضخیم کر دیا کہ وہ حد سے متجاوز ہو گیا۔ اور ان سب کو جمع کرنا محال ہو گیا۔ ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ جہاں چند معانی اور مدلولات کے لئے کسی کو ضرورت پڑتی ہے تو مرادفات اس کثرت سے جمع ہو جاتی ہیں کہ ان کے لئے کسی ایک لفظ کا منتخب کرنا سخت مشکل ہو جاتا ہے۔ ہر قبیلہ کا اپنا اپنا عذر تھا، کیونکہ ایک چیز پر دلالت کرنے کیلئے ہر قبیلہ میں ایک کلمہ یا دو کلمے ہی ہوتے تھے جن سے وہ اپنی ضرورتیں پوری کر لیتے تھے۔ لیکن جب جامعینِ لغت کا دور آیا تو تمام قبائل کے تمام کلمات انھوں نے جمع کر دیئے اور ہمارے سامنے استعمال کرنے کیلئے پیش کر دیئے۔ اس ضخامت میں بھی ویسا ہی نقصان تھا جیسا کہ قلت اور کمی میں نقصان تھا۔

یہ سارے عربی قبائل فصاحت کے ایک درجہ میں نہیں تھے۔ بعض قبائل دوسرے بعض قبائل سے فصاحت میں ممتاز تھے کیونکہ لغت کی حفاظت میں سب یکساں نہیں تھے۔ بعض قبائل دوسروں کے مقابلہ میں اپنے بعد مکانی کی بنا پر اپنی عربیت کو اختلاط اور فساد سے محفوظ رکھ سکے۔ جب ان علماء کا دور آیا جنھوں نے لغت کو نقل کیا ہے تو انھوں نے انتخاب سے کام لیا اور بعض لغات کو بعض پر انھوں نے فضیلت دی۔ چنانچہ لغتِ حمیر کو انھوں نے مستبعد قرار دیا کیونکہ وہ لغتِ مضر کے مقابلہ میں ایک مستقل لغت کی حیثیت

---

[1] ہمارے نزدیک اس روایت کی صحت محلِ نظر ہے۔ ابن عباسؓ جیسی ہستی جو قرآنی علم میں بڑا پایہ رکھتی ہے ایسی بات کبھی نہیں کہہ سکتی تھی۔ قرآن ایک ہی لغت میں اترا ہے اور وہ وہی لغت ہے جس میں وہ آج ہمارے پاس موجود ہے۔ (طلوع اسلام)

رکھتا تھا۔ یہ لوگ حبشیوں، یہودیوں اور اہل فارس کے ساتھ ملے جلے رہتے تھے، لہٰذا ان کا لغت مختلط ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ علماء نے ان قبائل کے لغت کو بھی قبول نہیں کیا جو سرحدی علاقوں میں رہتے تھے کیونکہ وہ بھی مصر، شام، فارس اور ہند کے پڑوس میں واقع تھے۔ ایسے ہی لخم، جذام، قضاعہ، غسان، تغلب قبائل سے انھوں نے روایت نہیں کی اور بنو حنیفہ اور سکان یمامہ، ثقیف اور اہل طائف کے لغات کو بھی قبول نہیں کیا گیا کیونکہ یہ قبائل بھی یمنی تاجروں سے ملے جلے رہتے تھے جو ان کے پاس ہی مقیم تھے۔ ساتھ ہی شہری آبادیوں کا لغت بھی قبول نہیں کیا گیا کیونکہ ان کی زبان بھی خراب ہو چکی تھی۔

عرب کے قبائل میں سے جن قبائل سے لغت عرب نقل کیا گیا اور جن کی پیروی کی گئی یعنی جن کی زبان مستند مانی گئی وہ قیس، تمیم، اسد، ہذیل، بعض کنانی اور بعض طائی قبائل ہیں۔ ان کے علاوہ باقی قبائل کا لغت قبول نہیں کیا گیا۔ ابو عمرو بن العلاء نے کہا ہے کہ عرب میں فصیح ترین ہوازن کے اوپر کی آبادیوں کے لوگ اور تمیم کے نیچے کی آبادیوں کے لوگ تسلیم کئے جاتے ہیں۔ اس کی وجہ وہی تھی کہ یہ لوگ عرب میں سے انہی قبائل کا انتخاب کرتے تھے جو اپنی عربیت پر باقی ہوں اور غیروں کے ساتھ اختلاط نے ان کی زبان کو خراب کر دیا ہو۔ ابن جنی نے شہری آبادیوں سے لغت کو قبول نہ کرنے اور خیموں میں مقیم غیر شہری لوگوں سے قبول کرنے کے موضوع پر ایک مستقل باب باندھا ہے۔ ابن جنی نے کہا ہے کہ اس کی وجہ یہی ہے کہ شہری آبادیوں کی زبان میں اختلال، فساد اور آمیزش آچکی تھی۔ اگر یہ معلوم ہو سکے کہ فلاں شہر والے اپنی فصاحت پر باقی ہیں اور ان کی زبان میں کوئی فساد پیدا نہیں ہوا تو ان کا لغت قبول کرنا ایسا ہی ضروری ہوگا جیسا کہ غیر شہری آبادیوں کا۔ ایسے ہی اگر غیر شہری آبادیوں میں وہ اضطراب و اختلال پیدا ہو گیا ہو جو عموماً شہری آبادیوں کی زبان میں پیدا ہو جایا کرتا ہے تو ان کی زبان کو چھوڑ دینا اور قبول کرنا ایسا ہی ضروری ہو جائے گا۔

مگر اس کے باوجود قریش کو افصح العرب شمار کیا جاتا ہے۔ عربی زبان کے علماء، عربی اشعار کے رواۃ، ان کے لغات، ایام اور مقامات سے واقف کار لوگوں کا اس پر اجماع ہے کہ قریش کے لوگ زبان کے اعتبار سے فصیح ترین اور لغت کے اعتبار سے پاکیزہ ترین تھے۔

بعض لوگوں نے اس قول میں شک کیا ہے، کیونکہ قریش مکہ اور اس کے اطراف میں رہتے تھے اور یہ شہری لوگ تھے۔ علاوہ ازیں یہ تجارت بھی کرتے تھے اور تجارت لغت کو خراب کر دیتی ہے۔ لغت کے اعتبار سے اہل یمن کی زبان میں بھی یہی عیب نکالا جاتا ہے۔ رسول اللہ صلعم کی پرورش بنو سعد بن بکر بن ہوازن کے قبیلہ میں ہوئی تھی۔ وہیں آپ نے شیر خوارگی کا زمانہ گذارا۔ آپ نے اسی قبیلہ سے فصاحت سیکھی۔ اکثر قریش کے لڑکے نبی اکرم صلعم کے عہد میں لغت اور فصاحت سیکھنے کے لئے بنو سعد ہی میں بھیجے جاتے تھے۔ اس بنا پر ان لوگوں نے خیال کر لیا ہے کہ یہ رائے لغت میں قریش کی شان کو بلند کرنے کیلئے گھڑ لی گئی ہے کیونکہ رسول اللہ صلعم ان میں سے تھے۔

جہاں تک میرا خیال ہے کسی لغت کا بیرونی الفاظ کے داخل ہونے سے محفوظ رہنا فصاحت سے الگ چیز ہے۔ بنو سعد میں لغت کی حفاظت اس سے کہیں بہتر تھی جتنی قریش میں تھی کیونکہ بنو سعد کا قبیلہ غیر شہری تھا اور تجارت اور غیروں کے اختلاط سے بہت دور تھا۔ اس کے برعکس قریش کا قبیلہ شہری آبادی تھا اور ان میں سے اکثر لوگ تجارت کیلئے شام مصر وغیرہ ممالک میں جاتے رہتے تھے۔ ان ملکوں میں تجارت کرتے، ان کی زبانیں سنتے تھے۔ لہٰذا جہاں تک لغت کی حفاظت کا تعلق ہے ان پر بھی وہی حکم لگانا چاہئے جو ایسے دوسرے قبائل پر لگایا جاتا ہے

جو دوسری قوموں کے ساتھ اختلاط رکھتے تھے لیکن فصاحت کی رو سے اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ لوگ فصیح تھے۔ فصاحت سے میری مراد اپنے مافی الضمیر کو قوت کے ساتھ تعبیر کر دینا ہے۔ اس امر میں یہ لوگ اسلام کے بعد بھی ممتاز رہے ہیں۔ اس فصاحت کے ساتھ ساتھ ان کی زبان کی نرمی، الفاظ کا حسنِ انتخاب یہ مزید امتیازات ان کو حاصل تھے۔ عرب کے وفود مختلف میلوں ٹھیلوں یا حج کے لئے جب آتے تھے تو یہ ان کے کلام، اشعار اور لغات سے انتخاب کر لیتے تھے اس کی دقیق ترین تعبیر وہ ہو سکتی ہے جو فارابی نے اپنی کتاب "الالفاظ والحروف" کے مقدمہ میں بیان کی ہے۔ انھوں نے کہا ہے کہ تمام عرب میں قریش کو یہ فضیلت حاصل تھی کہ الفاظ کے انتخاب کا ان کو خاص سلیقہ تھا، فصیح ترین، بولنے میں سہل ترین، سننے میں حسین ترین اور مافی الضمیر کی ادائیگی میں واضح ترین الفاظ کو یہ لوگ منتخب کر لیتے تھے۔

قریش فصاحت میں ممتاز تھے تو بنو سعد لغت کی حفاظت میں ممتاز تھے۔ رسول اللہ صلعم میں دونوں خصوصیتیں جمع ہو گئی تھی۔ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا "علاوہ ازیں کہ میں قریش میں سے ہوں اور میری پرورش بنو سعد بن بکر میں ہوئی ہے میں عرب کا فصیح ترین آدمی ہوں"

جزیرۂ عرب، خصوصاً وسطِ جزیرہ کے سکان اسلام سے پہلے اپنے ارد گرد کے علاقوں اور آبادیوں سے بہت کم اتصال رکھتا تھا۔ لیکن جب اسلام آیا اور فتوحات شروع ہوئیں تو لغت پر اس کے اثرات قطعاً اُلٹے مرتب ہوئے۔ ایک طرف اگر لغت عربی مفتوح شہروں یعنی مصر، شام، عراق، فارس اور سندھ میں پھیل گیا اور ان شہروں کے لوگ آہستہ آہستہ عربی بولنے لگے حتیٰ کہ دوسری زبانوں پر عربی زبان غالب آ گئی تو لغت نے بھی ان تمام بولنے والوں سے جزیرۂ عرب کے بولنے والوں کی بہ نسبت کئی گنا زیادہ الفاظ کا ذخیرہ حاصل کر لیا۔

اس سے یہ بھی فائدہ پہنچا کہ ان شہروں میں سے ہر شہر نے لغت عربی کو ان کلمات کی غذا دی جنھیں وہ اس سے پہلے نہیں جانتی تھی۔ ہر شہر کے نباتات، حیوانات، لباس وغیرہ جن کا عربوں کو علم ہی نہیں تھا اب عربوں نے ان کو قبول کر کے اپنی لغت میں داخل کر لیا اور انھیں اپنے قواعد کے تابع کر لیا۔ یہ صحیح ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں بھی عرب کے لوگ الفاظ کو معرب بنانے پر مجبور ہوئے ہیں۔ چنانچہ اعشیٰ نے شہنشاہ کا لفظ اور امرؤ القیس نے سجنجل (آئینہ) کا لفظ استعمال کیا ہے۔ ان کے تاجر غیر ممالک سے مختلف قسم کی زیبائش و آرائش اور استعمالی چیزیں مختلف کپڑے، قسم قسم کی سبزیاں اور طرح طرح کی معمولی چیزیں لاتے تھے اور ان کے ساتھ ان کے نام بھی لاتے تھے۔

قرآن آیا اور اس نے بہت سے معرب کلمات کو استعمال کیا مثلاً زنجبیل، سجل، سجین، اور سلسبیل وغیرہ۔ حدیثوں میں بھی بعض اجنبی کلمات آئے جو اسی طرح معرب کر لیے گئے مثلاً فَإِنْ تَوَلَّيْتَ فَإِنَّمَا عَلَيْكَ إِثْمُ الْأَرِيسِيِّينَ۔ أَرِيسٌ اور إِرِّيسٌ اہل شام کی لغت میں کسان اور کھیتی کرنے والے کو کہتے ہیں۔ لیکن اسلام اور اسلامی فتوحات کے بعد یہ چیز بہت زیادہ بڑھ گئی۔ عرب فاتحوں نے فارس سے ان کے نباتات، حیوانات اور استعمالی اشیا لیں۔ یہی کچھ عراق، شام اور مصر میں کیا۔ چنانچہ حیوانات میں جاموس، بط، برذون اور فیل وغیرہ الفاظ لئے۔ نباتات میں فلفل، کمثری، خوخ، جوز، لوز، نرجس، ورد اور یاسمین وغیرہ الفاظ لئے۔ دواؤں میں قرفہ، مصطکا وغیرہ لئے، خوشبوؤں میں مسک، عنبر، اور صندل وغیرہ الفاظ لئے۔ لباس میں قمیص، سروال، کرباس، دیباج، ابریسم اور خز وغیرہ الفاظ لئے۔ ماکولات میں فالوذج، سمیذ، اور سُکّر وغیرہ الفاظ قبول کئے۔ معدنیات میں رصاص، زئبق اور جصّ

وغیرہ الفاظ، احجار میں زمرد، یاقوت اور فیروزہ وغیرہ الفاظ، اور آلات اور ہتھیاروں میں منجنیق، برکار، قانون، نائی، بربط، قمقم، طست، طبق، کوزہ، فنجان اور لجام وغیرہ الفاظ تھے۔ یہ الفاظ اس کثرت سے ہیں جنکو شمار نہیں کیا جا سکتا۔ اس موضوع پر بہت سی کتابیں لکھی گئیں۔ لغت عربی کے علماء جنھوں نے لغت کو مدون کیا ہے، مختلف لغات میں ماہر نہیں تھے لہذا انھوں نے بہت سے کلمات کو عربی الاصل قرار دے دیا ہے حالانکہ وہ دوسری بہت سی زبانوں سے مشتق ہیں۔ مثلاً منبر، یہ لفظ حبشی زبان کا ماخوذ ہے۔ حبشی زبان میں منبر کرسی یا بیٹھنے کی جگہ کو کہتے ہیں۔ لیکن علمائے لغت کہتے ہیں کہ یہ نَبَرَ سے مشتق ہے جس کے معنی بلند ہونے کے آتے ہیں۔ ایسے ہی نفاق کے متعلق ان کا قول یہ ہے کہ یہ نافقاء سے مشتق ہے حالانکہ حبشی زبان میں اس کے معنی دین میں بدعت کرنے کے ہوتے ہیں۔ ایسے ہی قَبَس کہ یہ خَبَس سے ماخوذ ہے جو لغت ہیروغلیفیہ میں چراغ کے معنی میں آتا ہے۔ ایسے ہی نبی کہ اس کے معنی ہیروغلیفیہ لغت میں خاندان کے سردار کے ہوتے ہیں۔

وہ اکثر جب کسی بیرونی لفظ کو معرب بناتے تھے تو اپنے اوزان میں سے کسی وزن پر اسکو ڈھال لیتے تھے جیسے دینار کہ یہ دیناریوس DENARIUS کا معرب ہے، اور کبھی اسے اس کے وزن پر باقی رکھ چھوڑتے تھے اگرچہ ان کے لغت میں اس کا کوئی وزن نہیں ہوتا تھا جیسے خراسان، ابراہیم، آجر، شطرنج، ابریسم وغیرہ۔ کبھی اس میں کوئی تبدیلی کر لیا کرتے تھے، اگرچہ اس تبدیلی کے باوجود بھی وہ ان کے اوزان کے ساتھ متفق نہیں ہوتا تھا جیسے شہنشاہ کہ شاہان شاہ کا معرب ہے۔

علماء عربیت کا اسمیں اختلاف ہے۔ جوہری تو کہتے ہیں کہ تعریب اسے کہتے ہیں کہ عرب لوگ کسی کلمہ کو اپنے نہج اور اسلوب پر بولنے لگیں۔ حریری کا خیال بھی یہی ہے چنانچہ "درۃ الغواص" میں انھوں نے لکھا ہے کہ شطرنج کے شین کا فتحہ غلط ہے اور صحیح کسرہ ہے تاکہ قِرطَعب اور جِردَحل کے وزن پر ہو جائے۔ ان دونوں کا یہ خیال ہے کہ عرب لوگ اگر کسی کلمہ کو اپنے لغت کے وزن کے خلاف بولنے لگیں جیسے خراسان، آجر تو یہ کلمات عربی نہیں کہلائیں گے بلکہ عجمی ہی کہلائیں گے۔ لیکن سیبویہ اور جمہور اہل لغت کا خیال یہ ہے کہ تعریب اسے کہتے ہیں کہ عرب لوگ کسی عجمی کلمہ کو اپنے ہاں استعمال کرنے لگیں خواہ وہ ان کے کلمات کے وزن پر نہ بھی ہو۔

عرب لوگ جب کسی کلمہ کو اپنے لغت میں داخل کر لیتے تھے تو اس پر اپنے تمام قوانین جاری کرنے لگتے تھے۔ اس پر اعراب کی تمام علامتیں وارد کرتے، الف اور لام سے اسکو معرفہ بناتے، مضاف، مضاف الیہ بنا لیتے، تثنیہ اور جمع کر لیتے بلکہ اس سے دیگر الفاظ مشتق کرنے لگتے تھے، چنانچہ زِندِیقٌ سے زَندَقَ اور تَزَندَقَ اور طِرازٌ سے طَرَّزَ، تَطَرَّزَ اور مُطَرِّزٌ، مُطَرَّزٌ اور دِیوانٌ سے دَوَّنَ، تَدوِینًا اور نَوروزٌ سے نَورَزَ اور لِجامٌ سے أَلجَمَ، مُلجَمٌ اور مصدر اِلجامٌ اور دِرهَمٌ سے دَرهَمَتْ ایسے ہی مَنجَنِیقٌ سے جَنَقُونَا وغیرہ افعال بنا لیتے تھے۔

معرب بنانے کا یہ دستور عباسی عہد میں بھی جاری تھا، بلکہ حیرت ہوتی ہے کہ یہ چیز غیر عرب لوگوں کے ہاتھوں میں بھی تھی چنانچہ ابن المقفع نے بازیار (باز پالنے والا) کو معرب بنا کر کلیلہ دمنہ میں استعمال کیا ہے۔ ایسے ہی سرجین (گوبر) فیج (بادشاہ کا ایلچی) أَساوِرَه (اَسوار کی جمع، اچھا تیر انداز) ایسے ہی جاحظ نے بھی بہت سے عجمی کلمات کو اپنی کتابوں میں معرب بنا کر استعمال کیا ہے جیسے کَرَابِج (کُربُج بمعنی دکان کی جمع) ایسے ہی نصاریٰ اور نساطرہ نے بھی امراض، نباتات اور علاج وغیرہ کے بہت سے عجمی ناموں کے کلمات کو معرب بنا بنا کر اپنی کتابوں میں استعمال کیا ہے۔

لغت عربی کے ضخیم ہو جانے کا ایک بڑا سبب یہ تعریب بھی تھا۔ اس کے ساتھ اس امر کا اضافہ اور کر لیجیے کہ کلمات کے مدلول اور معانی میں بہت سی تبدیلیاں کی گئیں۔ اسلامی معاشرہ نے لغت میں بہت سے کلمات کے وہ نئے نئے معانی داخل کر دیئے جو اس سے پہلے معروف نہیں تھے۔ مثلاً مومن، مسلم، صلوٰۃ، زکوٰۃ، رکوع، سجود، ان کلمات کے مدلول جاہلیت میں اس سے قطعاً مختلف تھے جو اسلام میں ان سے لئے گئے۔ صَلوٰۃٌ جس کا مدلول محض دعا تھا، اب اس کا

مدلول خاص اشکال کے ساتھ خاص حرکات وسکنات قرار پا گیا۔ ایسے ہی زکوٰۃؐ جس کا مدلول نشوونما تھا اب اس کا مدلول حالتِ معینہ میں خاص طریقہ پر مال کو نکالنا قرار پا گیا وغیر ذٰلک۔ پھر مختلف مذاہب مثلاً معتزلہ، مرجۂ اور خوارج وغیرہ نے ان الفاظ کے اور خاص خاص معانی پیدا کئے۔ بہت سے کلمات مختلف ادوار میں مختلف معانی میں استعمال کئے گئے جیسے حاجب، دیوان، کاتب، وزیر وغیرہ۔ وَزِیْرٌ کا لفظ شروع میں مددگار کیلئے بولا جاتا تھا۔ اس کے بعد یہ خاص معنیٰ میں مستعمل ہونے لگا۔ ایسے ہی دِیْوَانٌ کا کلمہ اس رجسٹر پر بولا جاتا تھا جس میں مثلاً فوج کے نام درج ہوں پھر اس جگہ پر بولا جانے لگا جہاں وہ رجسٹر حفاظت سے رکھا جاتا تھا، پھر اس کو شاعر کے مجموعۂ اشعار پر بھی بولنے لگے چنانچہ دیوانِ بشار، دیوانِ عُمَرو ابنِ اَبِی رَبِیْعَۃَ وغیرہ بولنے لگے۔

بعض حادثات بھی بعض کلمات کو خاص معانی میں استعمال کرنے کا سبب بنے جن سے پہلے وہ ان معانی میں مستعمل نہیں ہوتے تھے۔ ابن درید نے جمہرہ میں لکھا ہے کہ بعض اہل لغت نے تصریح کی ہے کہ جَائِزَۃٌ بمعنی عطیہ وانعام (جس کی جمع جوائز آتی ہے) اسلامی کلمہ ہے جس کی اصل یہ ہے کہ امرائے فوج میں سے ایک امیر کا دشمن سے مقابلہ ہوا۔ دونوں فوجوں کے درمیان ایک نہر حائل تھی۔ امیر نے اعلان کر دیا مَنْ جَازَ ھٰذَا النَّھْرَ فَلَہٗ کَذَا وَکَذَا (جو اس نہر کو عبور کر جائے اسے اتنا اتنا انعام دیا جائیگا) لوگ نہر کو عبور کرنے لگے جو نہر کو عبور کر لیتا اسے انعام دیدیا جاتا۔ اس پر لوگ کہنے لگے نَخَذَ فُلَانٌ جَائِزَۃً (فلاں نے نہر عبور کرنے کا انعام لے لیا۔ یہیں سے ہر انعام کو جَائِزَۃٌ اور جَوَائِزُ کہنے لگے۔

علوم پیدا ہوئے، علما نے اس کیلئے خاص خاص اصطلاحات وضع کیں۔ ان اصطلاحات میں زیادہ تر عربی کلمات کو لیا گیا اور ان کا مدلول بدل لیا گیا۔ عَرُوض، بحر طویل، بسیط، مَدِیْد، نَحْوٌ، فَاعِلٌ، مَفْعُوْلٌ، مَنْطِقٌ، قَضِیَّۃٌ، مَوْضُوْعٌ، مَحْمُوْلٌ، اُصُوْلُ الْفِقْہِ، قِیَاسٌ، اِسْتِحْسَانٌ وغیرہ بہت سے کلمات کے لغت اور معاجم میں نئے نئے معانی داخل ہو گئے جن کا پہلے عربوں کو کوئی علم ہی نہیں تھا۔

یہ صحیح ہے کہ اسلام اور فتوحات اور اس کے نتیجہ میں حضارت، لغت عربی کے پھیل جانے اور وسیع ہونے کا سبب بنا لیکن اس کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے جس سے غفلت برتنا صحیح نہیں ہے، وہ یہ کہ اسلامی فتوحات نے حضارت وتمدن ایسی چیزیں بھی پیدا کر دیں جن کے نقصانات کم نہیں تھے۔ ان میں سے ایک یہ چیز تھی کہ جزیرۂ عرب عجمیوں کی ایک چراگاہ بن گیا۔ خلفائے راشدین کے عہد میں اسلام کا پایۂ تخت مدینۂ منورہ تھا۔ اور اطراف واکناف کے مسلمان حج کیلئے مکۂ معظمہ میں جمع ہوتے تھے۔ عجمی لوگ کبھی حج کیلئے فوج در فوج مکہ میں جمع ہوتے تھے اور کبھی اپنی ضروریات پورا کرنے کیلئے دارالحکومت (مدینہ منورہ) میں آتے تھے۔ جزیرہ کے عرب فتوحات کے نتیجہ میں بیشمار غلاموں اور باندیوں کے مالک بن گئے جو اپنے مالکوں کے ساتھ حجاز وغیرہ میں رہتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عجمی لوگ عربوں کے ساتھ ان کے گھروں میں، بازاروں میں، عبادات میں، مسجدوں میں ہر جگہ مختلط ہو گئے اور یہیں سے عربی زبان میں خلل واقع ہونا شروع ہو گیا۔ یہ لوگ سیکھ سیکھ کر عربی بولتے تھے اس سیکھنے میں فساد نے راہ پائی شروع کر دی اور غلط کلامی عام ہو گئی۔ عربوں کا یہی حال دوسرے شہروں میں بھی تھا۔ مصر کے عرب قبطیوں کے ساتھ مختلط ہوئے، شام کے عرب شامیوں کے ساتھ اور عراق کے عرب فارسی اور نبطی لوگوں کے ساتھ مختلط ہو گئے تو غلط گوئی خود عربوں تک میں سرایت کر گئی۔ اس غلط کلامی پر یہ چیز اور بھی مددگار ثابت ہوئی کہ لغت عربی معرب (حرکات والا) لغت ہے جس کی بنا پر یہ مشکل ترین لغات میں شمار ہوتا ہے اور فساد اس میں جلد داخل ہو جاتا ہے۔ یہ غلط کلامی پرانے زمانے سے چلی آتی تھی۔ روایات میں ہے کہ کسی نے رسول اللہ صلعم کے سامنے غلط بولا تو آپ نے فرمایا اَرْشِدُوْا اَخَاکُمْ (تم اپنے بھائی کی راہنمائی کرو) نیز روایات ہی میں ہے کہ ابوموسیٰ اشعریؓ کے کاتب نے حضرت عمرؓ کو لکھا مِنْ اَبُوْ مُوْسٰی تو حضرت عمرؓ نے ابوموسیٰؓ کو تحریر فرمایا "میں تمہیں سخت تاکید کرتا ہوں کہ اپنے اس کاتب کو کوڑوں کی سزا دو"۔ لوگوں کا بیان ہے کہ حضرت ابن عمرؓ اپنی اولاد کو غلط کلامی پر مارا کرتے تھے۔ یہ غلط کلامی شہروں تک ہی محدود نہیں تھی بلکہ دیہات تک میں سرایت کر چکی تھی۔

جاحظ نے لکھا ہے کہ دیہات میں جو پہلی غلط کلامی سنی گئی وہ ھٰذِہٖ عَصَاتِیْ ہے (ھٰذَا عَصَایَ کی جگہ۔ یعنی مذکر کو مونث استعمال کیا گیا ہے) سعد بن ابی وقاص (فاتح ایران) کے بیٹے محمد غلط بولتے تھے۔ اور حجاج ابن یوسف (گورنر عراق) تو اکثر غلط بولتے تھے۔ عہد عباسی میں یہ غلط گوئی اتنی عام ہو گئی کہ اس سے پہلے نہیں تھی کیونکہ ان کے عہد میں یہ اختلاط بہت بڑھ گیا تھا۔

ان تمام باتوں نے علماء کو اس پر متوجہ کیا کہ عربیت کی حفاظت کیلئے وہ کچھ قواعد بنائیں یہیں سے علم نحو اور علم لغت پیدا ہوئے۔

جیسا کہ محدثین حدیث جمع کرنے پر، اور فقہاء حدیث، فتاویٰ صحابہ اور فتاوائے تابعین کی تدوین پر متوجہ ہوئے ایسے ہی کچھ لوگ لغت کو جمع کرنے پر بھی متوجہ ہوئے۔ ان کا مقصد ان کلمات کو جمع کرنا تھا جو عرب بولتے تھے اور ان کے معانی کی تحدید کرنا تھا۔ علماء اپنی کتابیں اور قلمدان لیکر دیہات میں پہنچ گئے تاکہ سنیں اور لکھیں۔ دیہات کے عرب شہروں میں آنے لگے تاکہ لغت ان سے لیا جائے۔ لیکن ان علماء نے جنھوں نے دیہات کے سفر کئے یا دیہاتی لوگ جن کے پاس آئے اور جنھوں نے لغت کی تدوین کی۔ یہ بڑی ہی کوتاہی کی کہ انھوں نے لغتِ عرب کو ایک وحدت شمار کیا حالانکہ مختلف قبائل میں الفاظ، تراکیب اور لہجوں کے اختلافات تھے۔ ان سفر کرنے والے علماء نے ہمیں یہ قطعاً نہیں بتایا کہ وہ کس طرف گیا تھا اور کن قبائل میں اس نے قیام کیا تھا اور وہ الفاظ اور لہجے کون سے ہیں جو اس نے فلاں قبیلہ سے اخذ کئے اور وہ الفاظ اور لہجے کون سے ہیں جو اس نے کسی دوسرے قبیلہ سے لئے۔ اور جب کوئی بدوی کسی شہر میں گیا ہے تو کونسے الفاظ اور لہجے اس سے لئے گئے اور وہ کس قبیلہ سے تھا۔ کہیں کہیں اس قبیل کی چیزیں مل جاتی ہیں لیکن وہ اسقدر کم ہیں جو لغت کو قبائل پر تقسیم کرنے کیلئے ہمیں کافی نہیں ہو سکتیں۔

اگر وہ ایسا کر جاتے تو اس سے ہمیں بڑے فوائد حاصل ہو سکتے۔ ہمیں معلوم ہو سکتا کہ کونسے الفاظ اور لہجے کس قبیلہ کے ساتھ مخصوص ہیں مترادفات اور ان کا منشاء ہمیں معلوم ہو سکتا۔ ہمیں وہ الفاظ معلوم ہو سکتے جن کے ساتھ ہر قبیلہ ممتاز تھا اور ساتھ ہی اس کا سبب بھی معلوم ہو سکتا اور جستجو کرنے والا اس سے بہت قیمتی نتائج پیدا کر سکتا۔ ان علماء نے ایسا نہیں کیا اور لغت کو جمع کرنے میں وہ اس نظریہ پر چلے کہ قبائل کے اختلافات سے قطع نظر لغتِ عربی ایک وحدت ہے جو ناقابل تقسیم ہے۔

تم کہو گے کہ جس چیز کی ہمیں تلاش ہے وہ تو بڑی آسان ہے۔ ہمارے پاس شعراء کا کلام موجود ہے اور صحیح طور پر ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ ان کے قبائل کون سے تھے۔ ہم جانتے ہیں کہ کون کون سے شاعر بنو تمیم کے ہیں اور کون کون سے قریش کے وغیرہ ذلک۔ جب ہم کسی ایک قبیلہ کے اشعار کو جمع کرلیں اور ان کے الفاظ، معانی اور تراکیب کو پڑھ لیں تو جو نتائج ہم نکالنا چاہتے ہیں وہ نکال سکتے ہیں مگر یہ بات محض ایک حد تک ہی صحیح ہے لیکن مقصد پیش نظر کے لئے یہ کافی نہیں کیونکہ شعر لغت کے سرچشموں میں سے ایک سرچشمہ ضرور ہے لیکن پورا سرچشمہ ہی نہیں ہے۔ علاوہ ازیں یہاں اس قسم کے الفاظ بکثرت موجود ہیں جنہیں ایک قبیلہ بولتا ہے لیکن وہ ان کے شعراء کے شعر میں بار نہیں پاتے کیونکہ وہ شعری الفاظ میں سے نہیں ہیں۔ یہ کہنا ایک حد تک صحیح ہے کہ شعر کی معجم اور لغت ہی الگ تھی۔

یہاں ایک دوسری مشکل بھی ہے جو دیگر مشکلات سے دشوارتر اور قابل غور ہے اور وہ یہ ہے کہ شعر و ادب میں جو عربوں سے نقل کیا جاتا ہے وہ تقریباً ایک ہی لغت میں ہے۔ علماء کہتے ہیں کہ تمیم عین بہت بولتے تھے (چنانچہ اَنَّ کو عَنَّ کہتے تھے) ایسے ہی قبیلہ بہراء تاء کو مکسور بولتے تھے (تَعلَمُونَ، تَصْنَعُونَ تاء کے کسرہ سے بولتے تھے) ... قبیلہ شین بہت بولتا تھا (چنانچہ اِنَّکَ، اِلَیْکَ کو اِنَّکِش اور اِلَیْکِش کہتے تھے) قبیلہ ہوازن اسی طرح سین بہت بولتا تھا (چنانچہ اعطیتک، منک، عنک کو اعطیتکس، منکس اور عنکس کہتے تھے) علماء نے بیان کیا ہے کہ

بعض قبائل اسماء جمع کرہ میں الف کو لازم رکھتے تھے چنانچہ هٰذَا اٰبَاءُ مَلْحَاہُ بولتے تھے۔ اسی قبیل کی اور بہت سی باتیں ان علماء نے نقل کی ہیں جن میں قبائلِ عرب مختلف تھے اور اسکی شہادت میں وہ ایک دو یا تین شعر بھی نقل کر دیتے ہیں لیکن جب ہم ان اشعار کی طرف رجوع کرتے ہیں جو ان قبائل سے نقل کئے گئے ہیں تو جو کچھ ان علماء نے بیان کیا ہے اس کا کوئی نشان ہمیں نہیں ملتا۔ ہم شعرائے تمیم کی طرف رجوع کرتے ہیں تو ان کا عین نظر نہیں آتا، ربیعہ کے شعراء کو دیکھتے ہیں تو ان کا شین کہیں نہیں ملتا۔ آخر اس کا سبب کیا ہے جو شعرائے جاہلیت اور شعرائے اسلام سب میں یکساں پایا جاتا ہے؟

کہہ سکتے ہیں کہ راویوں نے تغیر و تبدل کر دیا اور لغتِ فصیحہ کے مطابق اشعار کو نقل کر دیا مثلاً جہاں اَنْ پر زبر تھا وہاں انھوں نے زبر نقل کر دیا عنؑ کو اَنؑ کر دیا چنانچہ ذی الرمۃ کا یہ مصرعہ دونوں طرح نقل کیا گیا ہے۔

أَعَنْ تَرَسَّمْتَ مِنْ خَرْقَاءَ مَنْزِلَةً

اور أَأَنْ تَرَسَّمْتَ " " "

ایسے ہی ابن ہرمہ کا یہ مصرعہ بھی دونوں طرح منقول ہے:

أَعَنْ تَغَنَّتْ عَلَى سَاقٍ مُطَوَّقَةٌ

اور أَأَنْ تَغَنَّتْ " " "

لیکن یہ امر اصل اشکال کو حل نہیں کرتا۔ ایسے کلمات بھی تو موجود ہیں جنھیں شاعر اگر اپنے لغت کے مطابق بولے اور راوی لغتِ فصیح میں تبدیل کر دے تو وزن ہی خراب ہو جاتا ہے مثلاً ربیعہ کا شین اور ہوازن کے سین کا اضافہ۔ اگر شاعر نے اِنَّکِش کہا اور راوی نے اسے اِنَّکِ سے بدل دیا تو شعر کا وزن ٹوٹ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض محقق مستشرقین یہ فرض کر لینے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ تمام شعراء کا ایک خاص لہجہ تھا جس پر وہ اپنے اشعار کو نظم کرتے تھے اور خواہ ان کے قبائل میں کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو وہ اپنی نظم میں اسی لہجہ کی پیروی کرتے تھے۔ عادۃً جب شاعر باتیں کرتا تھا تو اپنے قبیلہ کی زبان اور لہجہ میں باتیں کرتا تھا لیکن یہی شاعر جب نظم کرتا تھا تو اپنی نظم میں مشترک طریقہ ہی کی پیروی کرتا تھا۔ جیسے کہ آج تک بھی یہی حالت باقی چلی آ رہی ہے کہ عربی بولنے والے مصری، شامی، عراقی وغیرہ مختلف لہجوں میں باتیں کرتے ہیں لیکن ادب اور شعر کی زبان میں بالکل متحد ہو جاتے ہیں۔ یہ ایک فرضی نظریہ ہے جو غور و فکر کا محتاج ہے۔ خصائص میں ابن جنی کے اس قول سے اس طرف اشارہ نکلتا ہے جہاں اس نے کہا ہے کہ جب ایک ہی آدمی کی زبان میں دو یا زیادہ لغات جمع ہو جائیں تو ہمیں اس کے کلام پر غور کرنا چاہئے۔ اگر دونوں لفظ اس کے کلام میں یکساں مستعمل ہوئے ہیں یعنی دونوں ایک ہی جیسی کثرت سے استعمال ہوئے ہیں تو بظاہر ایسا نظر آتا ہے کہ اس کا قبیلہ اس معنی میں ان دونوں لفظوں ہی کو استعمال کرتا تھا کیونکہ اہلِ عرب اوزانِ اشعار میں ضرورت کی وجہ سے اکثر ایسا کرتے تھے۔

بہرحال علماء نے ایک غیر منقسم وحدت شمار کرتے ہوئے عربی لغت کو جمع کرنے پر توجہ کی جس کے ماخذ متعدد تھے۔ سب سے پہلے قرآن کریم تھا جس میں مفردات اور ان کے استعمالات تھے جو علماء لغت کیلئے صحیح ترین ماخذ تھا۔ راغب اصفہانی نے کہا ہے کہ قرآن کے الفاظ کلام عرب کا مغز، لُبّ، خلاصہ اور انتخاب ہیں۔ انہی الفاظ پر حکماء اور فقہاء کا اعتماد ہے، شعراء اور بلغاء اپنی نظم و نثر میں انہی الفاظ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ قرآن کریم کے علاوہ جو الفاظ بچ جاتے ہیں وہ قرآنی الفاظ کی بہ نسبت ایسے ہیں جیسے عمدہ قسم کی کھجوروں کے مقابلہ میں چھلکے اور گٹھلیاں ہوتی ہیں۔ یا جیسے گیہوں کے

صاف دانوں کے مقابلہ میں تنکے اور بھس ہوا کرتے ہیں۔

مآلِ کار الفاظ قرآن لغات عربیہ کے مواد میں سے بہت بڑا مستند ذریعہ مانا جاتا ہے۔ علماء نے اسکے معانی کی تحدید میں بڑی کوششیں کی ہیں اور قرآنی الفاظ کے مدلولات کی توضیح ہی ان کے سفر کرنے اور لغات کو نقل کرنے کا بڑا باعث تھا۔ ایک ایک لفظ کے گرد اس کے متصلات کو انھوں نے جمع کیا اس کے اشتقاق اور اسکے مادہ کے متفرعات کو انھوں نے واضح کیا۔ مثلاً جب ان کے سامنے اُجَاجٌ کا لفظ قرآن کریم کی آیت ھٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَ ھٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ میں آیا تو انھوں نے اس کے معنی نمکین اور تیز نمکین بتائے۔ اس کے درمیان اور اَجِیْجُ النَّارِ کے درمیان انھوں نے مقابلہ کیا، پھر اَجَّ الظَّلِیْمُ (تاریکی حد سے تجاوز کر گئی) سے اسکو ملایا۔ ایسے ہی قرآن کے ان مختلف کلمات کے استعمال میں انھوں نے مقابلہ کیا جن کا مبنیٰ واحد تھا تاکہ ان کے معانی کی تحدید کی جاسکے اور ان کے درمیان مشابہت کی وجوہ تلاش کی جاسکیں مثلاً انھوں نے قرآنی آیت وَفَجَّرْنَا الْاَرْضَ عُیُوْنًا میں لفظ فَجَّرْ کو وَالْفَجْرِ وَلَیَالٍ عَشْرٍ میں اور اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ کَانَ مَشْھُوْدًا میں اَلْفَجْر کے لفظ سے ملایا ساتھ ہی اِنَّ کِتَابَ الْفُجَّارِ لَفِیْ سِجِّیْنٍ میں فُجَّار اور بَلْ یُرِیْدُ الْاِنْسَانُ لِیَفْجُرَ اَمَامَہٗ میں یَفْجُرَ اور فُجَّار سے ملا کر دیکھا۔

ایسے ہی ان کے مصادر میں سے جاہلی اور اسلامی شعراء کے وہ اشعار بھی ہیں جن سے استدلال کرنا صحیح ہو۔ ان اشعار میں بھی بہت سے کلمات مستعمل ہوئے ہیں۔ ان علماء نے ان کے معانی کی تلاش شروع کی۔ خود شعر کا بعض حصہ بھی بعض اوقات باقی حصے کے معانی کو واضح کر دیتا ہے۔

ان مصادر میں کا ایک ذریعہ دیہات میں اعرابی لوگوں سے ان کی باتوں کو سننا بھی تھا۔ یہ علماء اکثر نکلتے اور ان اعرابیوں میں کئی کئی سال گذارتے۔ اعرابیوں کے ساتھ اختلاط کرتے ان کے ساتھ کھاتے ان کے ساتھ پیتے، ان کی باتیں سنتے اور لغات جمع کرتے۔ مردوں عورتوں اور بچوں کو آپس میں اونٹوں میں، چراگاہوں میں نکاح اور طلاق اور تمام احوال میں باتیں کرتے سنتے، ان کی طرف کان لگاتے اور ان سے نقل کرتے۔ عہد بنوامیہ سے لیکر عباسی عہد کی ابتدا تک اسکا بہت زور شور رہا۔ ان اعرابیوں سے بہت کچھ نقل کیا گیا۔ اصمعی کہتے ہیں کہ میں نے کچھ بچوں کو حِمیٰ ضَرِیَّہ کے مقام پر رجز پڑھتے ہوئے دیکھا۔ میں کھڑا ہو گیا اور میں اپنا کام ہی بھول گیا اور جو کچھ میں سن رہا تھا اسے لکھتا جا رہا تھا۔ اتنے میں ایک بوڑھا آدمی آگیا اور کہنے لگا۔ "تم ان کمینوں کی باتیں کیا لکھ رہے ہو؟"

ابوزید کہتے ہیں کہ میں نے سو سال کی ایک بوڑھی اعرابی عورت سے پوچھا کہ تم سڑک پر جو آبادیاں ہیں وہاں کیوں نہیں آتیں تو وہ کہنے لگی اِنِّیْ اَخْزٰی اَنْ اَمْشِیَ فِی الزُّقَاقِ (مجھے سڑک پر چلتے ہوئے شرم آتی ہے) کسی دوسرے عالم کا قول ہے کہ میں نے ایک اعرابی عورت کو اپنی بیٹی سے یہ کہتے ہوئے سنا ھَمِّیْنِیْ اَصَابِعَکِ فِیْ رَاْسِیْ۔ (ذرا اپنی انگلیوں کو میرے سر میں ہلا دو۔ یعنی حرکت دیدو)۔

عربوں سے اس طرح پر لغات حاصل کرنے کا یہ طریقہ کبھی درست اور قابلِ اعتماد ہوتا تھا جس میں شک و شبہ کا احتمال نہیں ہوتا تھا۔ مثلاً عربوں نے کسی چیز کیطرف اشارہ کیا اور اس کا لفظ زبان سے بولدیا۔ یعنی کسی انسان کی طرف اشارہ کیا اور زبان سے اِنْسَانٌ کہا، ہاتھ کی طرف اشارہ کیا اور زبان سے یَدٌ کہا، آنکھ کی طرف اشارہ کیا اور زبان سے عَیْنٌ کہا۔ اور کبھی ایسا ہوتا تھا کہ قرائن سے پتہ چل جاتا تھا۔ مثلاً کوئی شخص شاعر کا یہ قول سنے:

قَوْمٌ اِذَا الشَّرُّ اَبْدٰی نَاجِذَیْهِ لَهُمْ　　طَارُوْا اِلَیْهِ زَرَافَاتٍ وَّوُحْدَانَا

(وہ ایسی قوم ہے کہ جونہی شران کیلئے اپنے دانت نکالتا ہے تو وہ اس کی طرف الگ الگ اور گروہ گروہ بن بن کر اڑتے ہوئے جاتے ہیں)

سننے والا فوراً سمجھ جاتا ہے کہ زرافات کے معنی جماعتوں اور گروہوں کے ہیں۔ اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ لغات حاصل کرنے کا یہ طریقہ درست اور قابلِ اعتماد نہیں ہوتا۔ اس کے معنی میں شک و شبہ کا احتمال ہوتا ہے۔ بلکہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ پوری باریکی کے ساتھ خود عربی النسل آدمی بھی اس کو نہیں سمجھ سکتا۔ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ کسی اعرابی نے "اَلْیَرَنْدَجُ" کا کلمہ سنا تو اس کلمہ اور ماحول کے قرائن سے اس نے سمجھا کہ یہ کوئی بنا ہوا کپڑا ہوتا ہے۔ حالانکہ دراصل وہ رنگی ہوئی کھال کو کہتے ہیں۔ ایسے ہی کسی اعرابی سے اَلْیَلَبُ کا لفظ سُنا تو وہ سمجھا کہ یہ کوئی عمدہ قسم کا لوہا ہوتا ہے حالانکہ دراصل اَلْیَلَبُ کھال کو کہتے ہیں۔ ابو حاتم کہتے ہیں کہ میں نے ام الہیثم سے پوچھا کہ وَغَدٌ کسے کہتے ہیں۔ تو اس نے بتایا کہ کمزور اور ضعیف کو کہتے ہیں۔ میں نے کہا کہ تم نے تو ایک مرتبہ بتایا تھا کہ اَلْوَغَدُ غلام کو کہتے ہیں۔ ام الہیثم کہنے لگی کہ "تو آخر غلام سے زیادہ ضعیف اور کمزور کون ہوتا ہے؟" تو جب خود اعرابیوں کا یہ حال تھا تو تم لغت کے ان اصول کے متعلق کیا توقعات قائم کر سکتے ہو جو ان اعرابیوں میں جا کر رہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اکثر غلطی کر جاتے ہیں گو اکثر قریب قریب بھی پہنچ جاتے ہیں۔ بلاشبہ یہی اس اختلاف کا سبب ہے جو تم لغت کی کتابوں میں کلمات کی تفسیر میں دیکھتے ہو۔ مثال کے طور پر۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ اَلْقَیْضُ انڈے کا اوپر کا خشک چھلکا ہوتا ہے۔ دوسرے لوگ کہتے ہیں کہ ـــ وہ انڈا ہوتا ہے جس سے اس کا بچہ یا سفیدی وغیرہ نکل چکی ہو ـــ تیسرے لوگ کہتے ہیں کہ ـــ ہموار پھیلی ہوئی صاف زمین کو کہتے ہیں۔ ایسے ہی بعض علماء کا بیان ہے کہ اَلْبَسِیْطَۃُ زمین کو کہتے ہیں بلکہ اس کا ایک نام ہی ہے۔ ابو عبید نے کہا ہے کہ ـــ وسیع اور عریض زمین کو کہتے ہیں۔ بہرحال ان اختلافات کی بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ یہ لوگ کلمات کی تفسیر میں جیسا کچھ انھوں نے اعرابیوں سے سن کر سمجھا ہے اس کے مطابق اختلاف کرتے ہیں۔

جمع لغت کے یہ اولین مصادر تھے۔ قرآن، شعر جس کی صحت کا اور اس کے کہنے والے کی عربیت کا اعتماد ہو، اور عربوں سے بالمشافہ گفتگو کرنا اور ان کی باتیں سننا۔ علماء کے اس پہلے دور کے بعد بعد میں آنے والے علماء کے مصادر میں سے ایک سرچشمہ اپنے سے پہلے علماء کے اقوال اور روایات بھی ہو گئیں اور اس طرح مختلف علماء نے گذشتہ مصادر سے جو کچھ نقل کیا تھا اس کو جمع کر لیا۔ چنانچہ وہ لوگ کہتے ہیں اَمْلٰی عَلَیْنَا فُلَانٌ کَذَا (ہمیں فلاں شخص نے ایسا ایسا لکھوایا)۔ فراء کہتے ہیں کہ میں نے کسائی کو کہتے ہوئے سنا کہ میں نے عربوں سے سنا ہے اِسْقِنِیْ شَرْبَۃً مَّا (یعنی شَرْبَۃَ مَاءٍ۔ مجھے پینے کا پانی پلا دو)۔ عبدالرحمٰن کہتے ہیں کہ مجھ سے میرے چچا اصمعی نے بیان کیا کہ میں نے ایک اعرابی کو سنا جو کسی دوسرے آدمی کو دعا دے رہا تھا جَنَّبَکَ اللّٰہُ الْاَمْرَیْنِ (خدا تجھے دونوں کڑوی چیزوں یعنی فقر و عریانی سے دور رکھے)۔ ابو المہنال کہتے ہیں کہ ہمیں ابو زید نے خبر دی کہ السَّانِحُ اس پرندہ یا ہرن کو کہتے ہیں تمہارے پاس سے گذرے تو تمہاری دائیں جانب تمہاری طرف ہو اور اَلْبَارِحُ اس پرندہ یا ہرن کو کہتے ہیں جس کی بائیں جانب تمہاری طرف پڑے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ یہ علماء اپنے سے سابق علماء کی کتابوں سے استفادہ کرتے تھے مثلاً ابن الانباری کہتے ہیں کہ میں نے اپنے والد کی کتاب میں پایا کہ احمد بن عبید نے ابو نصر سے روایت کی ہے کہ اصمعی کہا کرتے تھے اَلْجَلَلُ چھوٹی اور تھوڑی چیز کو کہتے ہیں۔ اصمعی نے اَلْجَلَلُ کے معنی عظیم اور بڑے کے نہیں بتائے۔

یہ چیز کثرتِ جمع کا سبب بن گئی کیونکہ ہر عالم نے وہی چیزیں جمع کی تھیں جو اس نے سنی تھیں اور جنھیں وہ جانتا تھا۔ مگر اس کے پاس ہی ایک دوسرا عالم ہوتا تھا جس نے کچھ دوسری چیزیں سنیں اور کچھ دوسری چیزوں کو جانا۔ ان کے بعد والا طبقہ آیا تو جو کچھ علماء کے پاس منتشر طور پر موجود تھا اس سب کو جمع کر لیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر آنیوالا طبقہ اپنے سے پہلے کے علماء کے مقابلہ میں زیادہ وسیع معرفت رکھتا تھا۔ ان کی حالت اس باب میں بالکل وہی تھی جو محدثین کی تھی۔ ہر صحابی کچھ حدیثیں جانتا تھا۔ تابعی کا دور آیا تو اس نے تمام صحابہ سے احادیث سنیں۔ پھر تبع تابعین کا دور آیا تو اس نے اس سے بھی بڑے عدد سے احادیث سنیں حتیٰ کہ وہ طبقہ پیدا ہوا جس نے مصر، شام اور عراق کے سفر کئے اور علماء کے پاس جو کچھ احادیث تھیں ان کو جمع کر لیا۔ اس بنا پر ہمارے پاس حدیث کی بڑی بڑی موٹی موٹی کتابیں بن گئیں۔ بلکہ علماء لغت نے بھی اخذ اور تحمل کے درجات کو اسی طرح پر ترتیب دیا ہے جس طرح محدثین نے کیا تھا۔ چنانچہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ أَمْلَى عَلَيْنَا کا درجہ سَمِعْتُ سے اونچا ہے اور سَمِعْتُ کا درجہ حَدَّثَنِي سے اونچا ہے اور حَدَّثَنِي کا درجہ أَخْبَرَنِي سے بلند ہے جیسا کہ محدثین نے اپنے ہاں کیا ہے۔ ان سب میں کم تر درجہ ان روایات کا تھا جو کتابوں اور صحیفوں سے لی گئی تھیں۔

لغت کی روایت میں ان لوگوں نے اسی طرح ابتداء کی جس طرح محدثین نے کی تھی چنانچہ یہ لوگ بھی سند کو بیان کرتے تھے چنانچہ مثلاً ثعلب اپنی أمالي (کتاب) میں لکھتے ہیں مجھ سے ابوبکر ابن الانباری نے بیان کیا انھوں نے ابو العباس سے، انھوں نے ابن الاعرابی سے کہ انھوں نے کہا کہ لَحَنَ الرَّجُلُ يَلْحَنُ لَحْنًا فَهُوَ لَاحِنٌ کے معنی ہیں بولنے میں غلطی کر جانا اور لَحِنَ يَلْحَنُ لَحَنًا فَهُوَ لَحِنٌ کے معنی ہیں بات کی تہ کو پہنچ جانا اور سمجھ لینا۔ لیکن علماء لغت اس طریقہ پر زیادہ عرصہ تک کاربند نہیں رہ سکے جیسا کہ محدثین کاربند رہے۔ چنانچہ ہمارے پاس سند کے ساتھ لغت کی کوئی معجم موجود نہیں ہے جیسا کہ سند کے ساتھ بخاری اور مسلم موجود ہیں۔ اس کا سبب غالباً یہی تھا کہ لغت کا باب حدیث کے مقابلہ میں بہت زیادہ وسیع تھا۔ اگر ہر کلمہ اور ہر اشتقاق میں سند کا التزام کیا جاتا تو معجم کا حجم اس حد تک پہنچ جاتا جس کی قدرت انسانوں کو نہیں ہو سکتی تھی۔ علاوہ ازیں الفاظ قرآن کے علاوہ لغت کے الفاظ کو وہ تقدیس بھی حاصل نہیں تھی جو حدیث کو حاصل تھی۔

اہل حدیث کی طرح حدیث کے طریقہ پر علماء لغت نے بھی لغت کی ترتیب قائم کی ہے چنانچہ ان کے ہاں فصیح، افصح، جید، اجود، ضعیف، منکر، متروک کی اصطلاحات موجود ہیں جیسا کہ حدیث میں لوگوں نے صحیح، حسن، ضعیف وغیرہ کی اصطلاحات مقرر کی تھیں۔ علماء لغت نے تصریح کی ہے کہ جو الفاظ قرآن میں آگئے ہیں وہ دوسرے الفاظ سے افصح ہیں۔ چنانچہ ان کا قول ہے کہ أَدْفِئْ بِالْعَهْدِ وَفِّ بِالْعَهْدِ سے زیادہ فصیح ہے اور مِرْزَابٌ بھی مِيزَابٌ میں ایک لغت ہے مگر فصیح نہیں ہے۔ اَلْخَوَى (مقصور) بھوک کے معنی میں آتا ہے۔ کچھ لوگوں نے اس کو اَلْخَوَاءُ (بالمد) بھی بتایا ہے مگر یہ لفظ بلند نہیں ہے۔ ایسے ہی رَضِعَتِ الشَّاةُ ایک لغت ضرور ہے مگر پسندیدہ نہیں ہے۔ فصیح لغت رَضَعَتْ ہے۔ ایسے ہی دَمِعَتْ عَيْنِي (بکسر المیم) ردی لغت ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ ان لوگوں نے بعض کلمات کو بعض پر برتری دینے اور بعض کو بعض سے زیادہ فصیح قرار دینے، بعض لغات اور لہجوں کو قبول کرنے اور بعض کو قبول نہ کرنے میں بہت سی باتوں کا لحاظ کیا ہے۔ مثلاً (۱) جس لفظ کو تمام قبائل بولتے ہوں وہ اس کلمہ سے بہتر ہوگا جسے صرف کوئی ایک قبیلہ بولتا ہو ــــ

(۲) جو کلمہ قیاس نحوی اور صرفی کے مطابق وارد ہو وہ اس سے برتر ہوگا جو قیاس نحوی و صرفی کے خلاف ہو۔ کسی شخص نے ابو عمرو ابن العلاءؒ سے پوچھا "مجھے بتاؤ تم نے وہ کونسا قانون رکھا ہے جس سے تم عربیت کو متعین کر سکو۔ کیا اس میں تمام عرب کا کلام داخل ہے؟" ابن العلاءؒ نے کہا: "نہیں" اس آدمی نے کہا: "جہاں عرب تمہارے خلاف بولتے ہوں اور ان کا بولنا حجت ہے تو تم کیا کرتے ہو؟" ابن العلاء نے کہا "میں اسے اکثر پر محمول کرتا ہوں اور جو قول اس اکثری سماع کے خلاف پڑے اسے ایک لغت شمار کرتا ہوں۔" (۳) جس کلمہ کو بہت سے علما نے روایت کیا ہو وہ اس کلمہ سے زیادہ صحیح ہوگا جسے کسی ایک راوی نے بیان کیا ہو۔ جمہرہ میں ہے کہ اصمعی نے کہا اَرْضٌ قِرْوَاحٌ، وَقِرْيَاحٌ وَقِرْحِيَاءٌ چٹیل ہموار زمین کو کہتے ہیں۔ اس باب میں قِرْحِيَاءٌ کا لغت اصمعی کے سوا کسی اور نے بیان نہیں کیا۔ ایسے ہی قالی نے کہا ہے — لحیانی نے کہا کہ اہل عرب بولتے ہیں فَقَعَدَ فُلَانٌ الْأُرْبُعَاءَ وَالْأُرْبُعَاوِيُّ۔ یعنی چار زانو ہو کر میٹھا لیکن یہ لغت نادر ہے لحیانی کے سوا سے کسی اور نے بیان نہیں کیا۔

رجال کی جرح و تعدیل میں بھی ان لوگوں نے محدثین ہی کی پیروی کی ہے۔ چنانچہ خلیل ابن احمد اور ابو عمرو بن العلاء کو مثلاً انھوں نے ثقہ قرار دیا ہے لیکن قطرب (متوفی ۲۰۶ھ) پر جرح کی ہے۔ یہ وہی بزرگوار ہیں جن کے متعلق ابن السکیت کا قول ہے کہ میں نے کتابوں کا ایک ڈھیر اس سے لکھ لیا مگر بعد میں معلوم ہوا کہ یہ شخص لغت میں جھوٹ بولتا ہے لہٰذا میں نے اس کی کوئی روایت نقل نہیں کی۔ لیکن یہ صحیح ہے کہ تحقیق و تفتیش کی دقتوں میں یہ لوگ اس مرتبہ تک کبھی نہیں پہنچ سکے جہاں تک محدثین پہنچے تھے۔

بہر حال جو کچھ لغت جمع کر لیا گیا ہے وہ سب کا سب اعتماد کے اعتبار سے ایک درجے میں نہیں ہے اور نہ ہی صحت کے ایک درجے میں ہے اکثر اس میں شک واقع ہو جاتا ہے بلکہ بعض اوقات متعدد جہات سے خلل اور فساد بھی واقع ہو جاتا ہے۔

(۱) بعض علمائے لغت اپنی روایات میں ثقہ نہیں تھے۔ خلیل ابن احمد نے کہا ہے کہ بڑے بڑے جید علما نے اکثر لوگوں میں وہ کلمات پھیلا دیے ہیں جو کلام عرب میں سے نہیں تھے۔ اس سے ان کا مقصد محض تلبیس اور تعنیت ہوتی تھی — لاحقی نے کہا ہے کہ مجھ سے سیبویہ نے پوچھا کہ فَعِلٌ کے عامل قرار دینے پر تمہیں عرب کی کوئی شہادت یاد ہے؟ تو میں نے فوراً سیبویہ کیلئے یہ ایک شعر گڑھ دیا۔

حَذِرٌ أُمُوراً لَا تَضِيرُ وَآمِنٌ ۔۔۔ مَا لَيْسَ مُنْجِيَهُ مِنَ الْأَقْدَارِ

ایسے ہی خلیل نے کہا کہ ضَهْيَدٌ جس کے معنی سخت آدمی کے ہوتے ہیں۔ یہ بناوٹی لفظ ہے، فصیح کلام میں کہیں نہیں ملتا۔ لوگوں نے کہا ہے کہ عَنْشَجٌ بدمنظر اور منقبض چہرے والے آدمی کو کہتے ہیں مگر یہ لفظ بھی بناوٹی ہے — جمہرہ میں ہے کہ فَيْعَلُولٌ کے باب میں اس وزن پر دو بناوٹی کلمے پائے جاتے ہیں۔ لوگوں نے کہا ہے کہ عَيْدَشُونٌ ایک چھوٹے جانور کو کہتے ہیں مگر یہ قول قابل [illegible] ضَيْفَعُوْنٌ [illegible] کے معنی سختی اور صلابت کے آتے ہیں مگر میں اس لفظ کو نہیں پہچانتا۔ اس قسم کے بہت سے الفاظ موجود ہیں جو گڑھے گئے ہیں۔ علماء کو اس قسم کے الفاظ گڑھنے پر اس شہرت کی خواہش نے برانگیختہ کیا کہ ہمیں بہت سے وہ الفاظ معلوم ہیں جو دوسرے لوگوں کو معلوم نہیں۔ کبھی ان سے کوئی حل کیا گیا جس کا جواب ان کے پاس نہیں ہوتا تھا تو غلط الفاظ گڑھ کر انھوں نے اپنی بات کی پیچ رکھی۔ ویسے علماء کے درمیان خلفاء اور امراء اور عام لوگوں کے سامنے اس قسم کے مقابلے ہوتے ہی رہتے تھے۔

(۲) جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے بعض علماء لغت نے کتابوں اور صحیفوں سے روایات نقل کی ہیں مگر پہلے زمانوں میں کتابت میں قرآن کے سوا باقی کتابوں میں نقطے ہوتے تھے اور نہ زیر زبر پیش سے لغات میں تصحیف اور غلطی واقع ہوئی۔ معری نے کہا ہے کہ اصل تصحیف یہ ہے کہ آدمی کسی لفظ کو کتاب میں پڑھ کر حاصل کرے اور کسی آدمی سے نہ سنا ہو۔ چنانچہ اس طرح اس کو صحیح سے غلط کر ڈالے۔ مزہر میں ہے کہ ائمہ لغت اور ائمہ حدیث کے بڑے بڑے جلیل القدر لوگوں سے تصحیف ہو گئی ہے۔ حتیٰ کہ امام احمد کو تو کہہ دینا پڑا کہ "غلطی اور تصحیف سے کون بچ سکتا ہے" یہی وجہ ہے کہ لغت کے بڑے بڑے امام مثل خلیل اور اصمعی وغیرہ بھی تصحیف سے محفوظ نہیں رہ سکے۔ منجملہ ان تصحیفات کے یوم بُعاث ہے۔ یہ اس دن کا نام ہے جس میں اوس اور خزرج کے درمیان جنگ ہوئی تھی۔ کتاب العین میں اسے غُعاث (غین معجمہ کے ساتھ) لکھا ہے۔ کتاب العین پر جو اعتراضات کئے گئے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کیونکہ یہ ایک مشہور دن ہے جس میں خلیل جیسے آدمی کو غلطی نہیں کرنی چاہئے تھی۔

عجاج نے پاکدامن عورتوں میں سے کسی عورت کی تعریف کرتے ہوئے کہا تھا:

وَحَاصِنٍ مِنْ حَاصِنَاتٍ مُلْسٍ   مِنَ الْأَذَى وَمِنْ قِرَافِ الْوَقْسِ

فِي قَنْسٍ مَجْدٍ فَاقَ كُلَّ قَنْسِ

(ارتکاب عیب وملامت سے پاک صاف پاکدامن عورتوں میں سے بعض پاکدامن عورتیں شریف اصل وبنیاد سے ہوتی ہیں جو ہر اصل وبنیاد پر فوقیت رکھتی ہیں۔) اس شعر میں ابو عبیدہ سے تصحیف ہوئی ہے چنانچہ آخری مصرعہ میں انھوں نے قَنْس کے بجائے قَبْس (بالباء الموحدہ) روایت کیا ہے۔ ایسے ہی اہل بصرہ نے اعشیٰ کا یہ شعر نقل کیا ہے:

نَفَى الذَّمَّ عَنْ رَهْطِ المحلق جَفْنَةٌ   كَجَابِيَةِ الشَّيْخِ الْعِرَاقِيِّ تَفْهَقُ

(محلق کے قبیلہ سے مذمت کو ایک بڑے لگن نے دور کر دیا ہے جو شیخ عراقی کے حوض کے برابر بڑا ہے اور لبالب بھرا رہتا ہے۔ یعنی وہ بڑا ہی مہمان نواز ہے) اس کی تفسیر اہل بصرہ نے یوں کی ہے کہ عراقی بوڑھے کو جب پانی مل جاتا ہے تو چونکہ وہ شہری ہوتا ہے اس لئے فوراً اپنا حوض بھر لیتا ہے کیونکہ اسے ان باتوں کا پتہ نہیں ہوتا کہ پھر کب پانی برسے گا یا پھر کہاں سے مل سکے گا۔ لیکن ام ہیثم اعرابیہ جو اہل کوفہ سے روایت کرنے والی ہے اس نے اس کو یوں روایت کیا ہے:

كَجَابِيَةِ السَّيْحِ الْعِرَاقِيِّ تَفْهَقُ

(عراقی نہر سے پانی پلنے والے حوض کی طرح جو ہر وقت لبالب بھرا رہتا ہے۔ کیونکہ اس کا پانی کبھی ختم نہیں ہوتا۔ اس میں برابر نہر سے پانی آتا رہتا ہے)
اسی طرح ایک ضرب المثل ہے: دَقَّكَ بِالْمِنْحَازِ حَبَّ الْقِلْقِلِ۔ قِلقِل کے دانوں کو ہاون دستہ میں ڈال کر تمہارا کوٹنا ہے۔
(یہ ضرب المثل اس وقت بولی جاتی ہے جبکہ کسی بخیل اور کنجوس آدمی سے اصرار کے ساتھ سوال کیا جائے اور کوئی نتیجہ برآمد نہ ہو۔) ــــ اصمعی نے کہا ہے کہ عام لوگ اسے حَبَّ الْفُلْفُلِ پڑھتے ہیں مگر یہ تصحیف ہے۔ یہ لفظ قلقل قاف کے ساتھ ہے۔ اس کے دانے بڑے ہی سخت اور ٹھوس ہوتے ہیں جن کا کوٹنا آسان نہیں ہوتا۔

ایسے ہی حارث بن حلزہ کے اس شعر میں اختلاف ہوا ہے جس میں وہ ایک قوم کا ذکر کرتا ہے جنھوں نے ان کو دوسرے لوگوں کے

جرم میں پکڑ لیا تھا۔ شعر یہ ہے:

عَنَنًا بَاطِلًا وَظُلْمًا كَمَا تُعْـــــتَرُ عَنْ حُجْرَةِ الرَّبِيْضِ الظِّبَاءُ

(زیادتی ہے، باطل ہے، ظلم ہے اور ایسا ہی ہے جیسا کہ پالتو بکریوں کے بدلہ میں ہرنوں کو ذبح کر دیا جائے) اسے بعض لوگوں نے تُعْتَرُ (عین اور راء مہملہ کے ساتھ) پڑھا ہے۔ بات یہ تھی کہ زمانۂ جاہلیت میں لوگ نذر مان لیا کرتے تھے کہ اگر میرے پاس سو اونٹ ہو گئے تو میں اللہ کے نام پر ایک بکری ذبح کر دوں گا۔ جب سو اونٹ ہو جاتے تو بکری ذبح کرتے ہوئے اس کا بخل مانع آتا تھا اور اس بکری کے بجائے ایک ہرن کو شکار کر کے ذبح کر دیا کرتا تھا۔ حارث کہتا ہے کہ جو کچھ تم کر رہے ہو یہ باطل اور ظلم ہے، یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی پلی ہوئی بکری کے بدلے ہرن کو ذبح کر دے۔ لیکن اصمعی اس شعر تُعْتَرُ (زائے معجمہ کے ساتھ) پڑھتے تھے اور اس کے معنی نیزہ مارنا کرتے تھے لیکن علما نے اصمعی کے اس قول کو تصحیف شمار کیا ہے۔ ایسے ہی حدیث میں ہے اَكْفِتُوْا صِبْيَانَكُمْ حَتّٰى تَذْهَبَ فَحْمَةُ الْعِشَاءِ (اپنے بچوں کو اپنے سے جدا نہ کیا کرو تا آنکہ شام کا جھٹپٹے کا وقت گذر جائے) ابو عمرو بن العلاء اسے فاء کے ساتھ کہتے تھے اور عیسیٰ بن عمر قاف کے ساتھ اور ہر ایک دوسرے پر تصحیف کا اعتراض کرتا تھا۔

لغت میں اس قسم کی بہت سی چیزیں آ گئی ہیں۔ کچھ معلوم ہو گئیں اور کھل گئیں اور کچھ معلوم نہ ہو سکیں نہ کھل سکیں۔ اس وجہ سے بلاشبہ ـــــ لغت میں جو کچھ آیا ہے اس میں شک واقع ہو جاتا ہے۔ مثلاً قاموس میں ہے اَلْعَلْتُ كَالْعَلْثِ فِيْ مَعَانِيْهِ (لفظ عَلْتٌ اپنے معانی میں عَلْثٌ کی طرح ہے) مجھے یقین ہے کہ ان میں سے کوئی سا ایک کلمہ دوسرے سے تصحیف شدہ ہے۔ اور ان کے راویوں نے یقیناً ان کی روایت کتابوں سے کی ہے۔

(۳) ان معانی کی تحدید و تعیین نہ کر سکنا جنھیں وہ نقل کرتے ہیں۔ کیونکہ بہت سے کلمات ـــــ جیسا کہ تم دیکھ چکے ہو ـــــ عربوں سے سن کر نقل کئے جاتے تھے۔ اور سننے والا ان کے معانی کو اشارہ سے نہیں بلکہ قرائن سے سمجھتا تھا۔ چنانچہ ایک سننے والا کچھ سمجھتا تھا اور دوسرا سننے والا کچھ۔ مثلاً کسی نے کسی عرب کو کہتے ہوئے سنا مَا أَصَابَتْنَا الْعَامَ قَابَةٌ۔ اس میں قَابَةٌ کی تفسیر کچھ لوگوں نے قطرۂ باراں سے کی تو دوسرے لوگوں نے کڑک، گرج سے کی۔ اسی کے ساتھ یہ بھی اضافہ کر لیجئے کہ جو اشعار ان کے سامنے روایت کئے جاتے تھے ان کے غریب الفاظ کی تفسیر میں اختلافات ہوتے تھے کیونکہ ہر شخص قرائن کو استعمال کرتے ہوئے اجتہاد کرتا تھا اور ان کے سمجھنے میں اختلاف ہو جاتا تھا۔

(۴) ان لوگوں نے مفرداتِ لغت کے حاصل کرنے میں اکثر ان اشعار پر اعتماد کیا ہے جو جاہلی یا اسلامی شعراء کی طرف جھوٹ موٹ منسوب کر دیئے گئے تھے۔ دراصل وہ تمام اشعار بعد کے شعراء مثل خلف اور حماد کے من گھڑت تھے۔ ان علماء نے "لَامِيَّةُ الْعَرَب" (ایک مشہور طویل قصیدہ) کے اشعار سے عموماً شہادت پکڑی ہے حالانکہ ثقہ لوگوں کا یہ بیان ہے کہ یہ سارا قصیدہ ہی بناوٹی ہے۔

(۵) اہل لغت نے کلمات کی اصل سے بھی تعرض کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ یہ لفظ مثلاً فارس یا روم وغیرہ سے لیا گیا ہے حالانکہ ان کا علم اپنے گرد و نواح کے لغات سے متعلق بہت ناقص تھا۔ ان میں کوئی ایک بھی ایسا نہیں تھا جو سیرو غلیفہ، حبشہ، سریانیہ، یونانیہ، عبریہ،

اور سبھیہ زبانوں کا صحیح طور پر علم رکھتا ہو حتی کہ وہ کلمات کی اصل اور اشتقاق کے بارہ میں کوئی قابل اعتماد بات کہہ سکتا ہو یہی وجہ ہے کہ لغات کے اندر وہ اپنے بیانات میں بہت سی غلطیوں میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ بہت سے کلمات کے متعلق انھوں نے خیال کر لیا ہے کہ وہ عبرانی ہیں حالانکہ وہ عبرانی نہیں ہیں۔ یا بہت سے الفاظ کے متعلق انھوں نے سمجھ لیا ہے کہ وہ سریانی ہیں حالانکہ وہ سریانی نہیں ہیں۔ ایسے ہی بہت سے کلمات کو انھوں نے عربی تسلیم کر لیا ہے حالانکہ وہ عربی نہیں ہیں۔ پھر کچھ کلمات سے ان کے مشتق ہونے کے دعوے کر دیئے ہیں حالانکہ یہ سب کچھ غلط ہے۔

(۶) ابن الانباری نے بیان کیا ہے کہ کلمات کی دو قسمیں ہیں۔ ایک کلمات متواترہ اور دوسرے آحاد۔ متواتر میں قرآن کا لغت اور حدیث اور کلام عرب کا وہ لغت جو تواتر سے منقول ہے۔ یہ قطعی ہے اور مفید علم ہو سکتا ہے۔ لیکن احاد جنھیں بعض اہل لغت نے نقل کیا ہے اور ان میں تواتر کی شرط نہیں پائی جاتی یقینی نہیں ہے۔

ان متواتر لغات کا مقابلہ غیر متواتر سے کیا جائے تو وہ بہت ہی کم ہوتے ہیں۔ بے شمار کلمات ایسے ہیں جنھیں اہل تواتر کی کسی جماعت نے نقل نہیں کیا۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ انھیں خلیل، ابو عمرو، اصمعی اور ان کے اقران نے نقل کیا ہے۔ بلا شبہ یہ لوگ نہ معصوم ہو سکتے تھے اور نہ تواتر کی حد کو پہنچ سکتے تھے لہٰذا وہ سب ظنی ہیں جن پر کوئی یقین نہیں کیا جا سکتا۔

اس تمام تفصیل سے ہمیں یہ بات معلوم ہو گئی کہ لغت عربی میں کچھ الفاظ تو ایسے ہیں جن کی صحت قطعی ہے۔ یہ قرآن وغیرہ کے الفاظ ہیں اور بہت سے الفاظ ایسے ہیں جو ظنی ہیں۔ ان میں شک اور فساد کا احتمال ہے۔

معراجِ انسانیت

(معارف القرآن ــ جلد چہارم)

ترجمان حقیقت جناب پرویز کا قلم اور سیرت صاحب قرآن علیہ التحیہ والسلام خود قرآن کے آئینہ میں۔ فی الحقیقت ہمارے اسلامی لٹریچر میں اپنی قسم کی پہلی کوشش ہے اور نہایت کامیاب۔ شروع میں قریب پونے دو سو صفحات میں دنیا کے تمام مذاہب کی تاریخ اور تہذیبی پس منظر ہے۔ اس میں بعض ایسے مذاہب کا بھی تذکرہ ہے جن کا شاید نام بھی آپ نے پہلے نہ سنا ہوگا۔ پھر نادر عنوانات کے ماتحت سیرت حضور سرور کائنات ﷺ جس میں دین کے متنوع گوشے نکھر کر سامنے آ گئے ہیں۔ اصل کتاب بڑے سائز کے ۸۳۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ مقدمہ وغیرہ کے ابتدائی پچاس صفحات اس سے الگ ہیں ــــ کاغذ اعلیٰ درجہ کا ولایتی گلیزڈ، جلد مضبوط اور حسین، گرد پوش مرصع اور دیدہ زیب، ٹائٹل اور صبح بہار کے عنوانات منقش اور رنگین۔ قیمت بیس روپے۔ محصول ڈاک و پیکنگ ایک روپیہ ساڑھے چھ آنے۔

ناظم ادارۂ طلوع اسلام۔ پوسٹ بکس ۷۳۱۳ ۔ کراچی

حقائق و عبر

(۱) فرعونی روح

۱۴ ستمبر کے ڈان میں یہ خبر نظر سے گذری کہ حکومتِ مصر نے فیصلہ کیا ہے کہ جمعہ کا خطبہ مرکزی حکومت کی وزارتِ اوقاف کی طرف سے مرتب ہوا کریگا اور ہر مسجد میں یہی خطبہ سنایا جایا کرے گا۔ یہ خطبات مذہبی، معاشرتی، سیاسی ہر قسم کے اختلافات سے یکسر پاک ہوں گے۔

یہ خبر پڑھکر ہمیں بڑی خوشی ہوئی کہ وحدتِ ملت کیلئے ایک موثر قدم اٹھا۔ لیکن ہم اپنے اس طاؤسی رقص کیلئے ابھی پورے طور پر پر پھیلانے نہ پائے تھے کہ نگاہ اس خبر کے پاؤں کی طرف جا پڑی جہاں لکھا تھا کہ یہ فیصلہ اس لئے کیا گیا ہے کہ کسی مسجد کے خطبۂ جمعہ میں وزیرِ اعظم جمال عبدالناصر صاحب کی حکومت پر نکتہ چینی کی گئی تھی۔

لاحول ولاقوۃ الا باللہ۔ قرآن میں ہے کہ خدا نے فرعونِ موسیٰ کے بدن کو محفوظ رکھا تھا تاکہ وہ آنیوالوں کیلئے وجہِ عبرت بن جائے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ابلیس نے فرعون کی روح کو بھی مصر سے جانے نہیں دیا۔ جو لوگ فاروق مصر کے جانے پر خوشیاں منا رہے تھے کہ ایک اسلامی ملک ملوکیت کی لعنت سے پاک ہوا انھیں پھر سے افسردہ ہو جانا چاہیئے کہ وہی دیو استبداد اب جمہوری قبا میں تاج رہا ہے۔ سچ کہا تھا کہنے والے نے کہ

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو — جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

خبر میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ وہ تنقید جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے اخوان المسلمون کی طرف سے کی گئی تھی۔ اس میں شبہ نہیں کہ اخوان المسلمون مصر میں وہی کچھ کر رہی ہے جو پاکستان میں جماعتِ اسلامی اور انڈونیشیا میں دارالسلام والے کر رہے ہیں۔ لیکن حکومتِ مصر نے اس باب میں جو قدم اٹھایا ہے وہ ہمارے نزدیک انتہائی استبداد کا مظاہرہ ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ ہمارے ہاں بھی یہ ہوتا چلا آرہا ہے (اور اب بھی ہو رہا ہے) کہ شہر میں دفعہ ۱۴۴ کا نفاذ ہے۔ پبلک جلسوں کی اجازت نہیں۔ اسلئے کہ مفسد پردازان جلسوں میں لوگوں کو تخریبی کارروائیوں پر برانگیختہ کرتے ہیں۔ تو یہی شر پسند لوگ مسجدوں میں جا گھستے ہیں اور وہاں وہ سب کچھ کرتے اور کہتے ہیں جو مسجد کے باہر قانوناً جرم ہوتا ہے۔ اور جب ان تک ہاتھ بڑھایا جائے تو یہ شور مچا دیتے ہیں کہ یہ مداخلت فی الدین ہے۔ مساجد کو اپنی فساد انگیزیوں کیلئے آڑ بنا لینا منافقت اور بزدلی کی بدترین مثال ہے۔ ہمارا ہمیشہ سے یہ خیال رہا ہے کہ جس بات کا کہنا کسی پبلک جلسہ میں جرم سمجھا جائے اسے مسجد کے اندر کہنا بھی جرم ہی ہونا چاہیئے۔ لیکن اس قسم کے جرائم کی روک تھام بھی عام قانون ہی کی رو سے ہونی چاہیئے نہ اس طرح کہ کسی مسجد میں کسی نے حکومت پر تنقید کی اور حکومت نے زبردستی ہر ایک سے اپنی شان میں قصیدے پڑھوانے شروع کر دیئے۔

ہم پھر دہرائے دیتے ہیں کہ ہمارے نزدیک وحدتِ خطبات بڑی مفید اسکیم ہے۔ لیکن جس جذبہ کے ماتحت مصر میں اس کا حکم دیا گیا ہے وہ خالص ملوکیت کا استبداد ہے۔

(۲) قربانی کیوں فرض ہے؟

جب طلوعِ اسلام نے یہ لکھا تھا کہ قرآن کریم کی نصوص صریحہ کے مطابق قربانی کا مقام صرف مکہ ہے اور وہ بھی صرف اس حد تک کہ جس سے کھانے پینے کی ضروریات پوری ہوں، یہ جو ہم دنیا کے ہر قریہ میں اور ہر گلی کوچہ میں عید کے موقعہ پر جانور ذبح کر دیتے ہیں اس کی دینی حیثیت قرآن کی رو سے کچھ نہیں۔ تو جماعت اسلامی کی طرف سے اس کی بڑی مخالفت ہوئی اور انھوں نے جوشِ غضب میں گالیاں تک نکالنا شروع کر دیں۔ اب بات ہماری سمجھ میں آئی کہ ایسا کیوں ہوا تھا جب ۱۴ ستمبر کے ڈان میں یہ خبر پڑھی کہ

گذشتہ عید کے موقعہ پر کراچی کی جماعتِ اسلامی نے تینتالیس ہزار تین سو چونتیس روپے کی کھالیں اکٹھی کیں۔

ہم شروع سے کہتے چلے آرہے ہیں کہ ملا کا مسئلہ ایک معاشی سوال ہے اور جب تک قوم اس نقطۂ نگاہ سے اس کا اطمینان بخش حل نہیں سوچے گی اس کے نقصانات سے بچ نہیں سکے گی۔ لیکن قوم کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ملا اپنے پانچ روپے کی کھال کی خاطر سو روپے کا بکرا ابلا دریغ ذبح کرا دیتا ہے۔ ہم پھر دہرائے دیتے ہیں کہ قرآن میں واضح الفاظ میں لکھا ہے کہ قربانی کا مقام کعبہ ہے اور اس کا مقصد سامانِ خورد و نوش کا بہم پہنچانا ہے۔ اس کے علاوہ کسی جگہ اس طرح بکرے ذبح کرنے کی سند قرآن سے کہیں نہیں ملتی۔ لیکن ملا کو اس سے کیا غرض ملے تو کھالیں ملتی ہیں۔

(۳) سرمایہ داروں کا مذہب

پچھلے دنوں حکومت نے کمیونسٹ پارٹی کو خلافِ قانون قرار دیا ہے۔ اس کے متعلق مجلۂ ترجمان القرآن کی ستمبر ۱۹۵۴ء کی اشاعت میں بڑے شد و مد سے لکھا گیا ہے کہ کمیونزم سے نمٹنے کیلئے یہ طریق کار بالکل غلط ہے۔ اس ضمن میں اسی رسالہ میں لکھا ہے کہ

ہمارے سرمایہ داروں اور زمینداروں کا طبقہ اور ہمارے موجودہ مسلم لیگی فرمانرواؤں کا گروہ جو خود اسی طبقہ سے برآمد ہوا ہے کمیونزم سے نمٹنے کیلئے تین ہی تدبیروں پر بھروسہ کئے ہوئے ہے۔

ان تدبیروں کے نقائص کو بیان کر کے لکھا گیا ہے کہ

مدعا یہ ہے کہ بغیر اس کے کہ اسلام کو اپنے لئے قبول کیا جائے اور ملک کا نظام اس کے اصولوں کے حوالہ کیا جائے، ساری جاگیرداریاں، زمینداریاں، . . . . جوں کی توں برقرار رکھتے ہوئے اسلام کو ان کا سنتری بنا کر محل کے دروازہ کے سامنے کھڑا کر دیا جائے۔

اس کے بعد ارشاد ہے کہ

کیا آپ حضرات روسی ترکستان کے جاگیرداروں اور پاشاؤں کی طرح ناجائز انتفاع کے کوڑھ کا شکار ہونے والے نظامِ معاشی کو سینہ سے لگا کر قرآن کو مورچہ پر کھڑا کرنا چاہتے ہیں کہ وہ اپنی آیات کے لشکروں کو کمیونزم کے خلاف لڑا دے۔

اس کے بعد کمیونزم کے متعلق لکھا ہے

یہ سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ مفاسد کا ایک تند و تیز ردِ عمل ہے۔

ان اقتباسات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ترجمان القرآن کے نزدیک :-

(۱) کمیونزم، زمیندارانہ اور جاگیردارانہ نظام کا ردِ عمل ہے۔

(۲) اسلام جاگیرداری اور زمینداری کے نظام کا سخت مخالف ہے۔

(۳) کمیونزم کا مقابلہ کبھی وہ لوگ نہیں کر سکتے جو زمینداری اور جاگیرداری کے غیر اسلامی نظام کے مؤید ہوں ——— اور

(۴) جماعت اسلامی، زمینداری اور جاگیرداری کے نظام کی سخت مخالف ہے۔

آپ سوچئے کہ زمینداری اور جاگیرداری نظام کہتے کسے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس نظام سے مطلب یہ ہے کہ زمین کو لوگوں کی ذاتی ملکیت سمجھا جائے۔ اس کے رقبہ پر کوئی حدبندی نہ کی جائے۔ اگر ایک شخص چاہے تو دس ہزار ایکڑ زمین کو اپنے قبضہ میں رکھ لے۔ پھر یہ زمین کاشتکاروں کو خاص شرائط کے ماتحت دے۔ وہ سال بھر خون پسینہ ایک کر کے فصل پیدا کریں اور اس میں سے آدھی یا اس سے بھی زیادہ زمیندار کے گھر بیٹھے بٹھائے آجائے۔ یہ اس آمدنی میں سے حکومت کا مالیہ (اور شریعت کا عشر) ادا کر دے۔ باقی آمدنی میں سے اور زمین خریدتا چلا جائے اور اس طرح خلقِ خدا کو اور اپنا دستِ نگر بناتا رہے۔ آپ غور کیجئے کہ زمینداری کا نظام یہی ہوتا ہے یا اس کے علاوہ کچھ اور۔

ترجمان القرآن نے اس کا ڈھنڈورہ پیٹا ہے کہ یہ حضرات اس نظام کے سب سے زیادہ مخالف ہیں۔ اس نظام کو انھوں نے کوڑھ بھی قرار دیا ہے اور اسلام کی ضد بھی۔

لیکن ذرا دیکھئے کہ اس خبیث نظام کے سب سے بڑے حامی کون ہیں۔ اسی جماعت کے امیر سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کی کتاب "مسئلہ ملکیتِ زمین" ہر جگہ ملتی ہے آپ دیکھئے کہ اس نظام کے متعلق اس میں کیا لکھا ہے۔ اس میں لکھا ہے۔

(۱) اسلامی قانونِ بیع وشریٰ نے کسی نوعیت کی جائز اشیاء کے معاملہ میں بھی انسان پر یہ پابندی عائد نہیں کی کہ آدمی زیادہ سے زیادہ ایک مخصوص حد تک ان کو خرید سکتا ہو اور اس حد سے زیادہ کی خریداری کا مجاز نہ ہو۔ خرید و فروخت کا یہ غیر محدود حق جس طرح تمام جائز چیزوں کے معاملہ میں آدمی کو حاصل ہے اسی طرح زمین کے معاملہ بھی حاصل ہے۔ (صفحہ ۵۲)

(۲) اسلام نے کسی نوع کی ملکیت پر بھی مقدار اور کمیت کے لحاظ سے کوئی حد نہیں لگائی جائز ذرائع سے جائز چیزوں کی ملکیت جبکہ اس سے تعلق رکھنے والے شرعی حقوق و واجبات ادا کئے جاتے رہیں بلا حد و نہایت رکھی جا سکتی ہے۔ روپیہ پیسہ، جانور، استعمالی اشیاء، مکانات، سواری، غرض کسی چیز کے معاملہ میں بھی قانوناً ملکیت کی مقدار پر کوئی حد نہیں۔ پھر آخر تنہا زرعی جائداد میں وہ کونسی خصوصیت ہے جس کی بنا پر صرف اس کے معاملہ میں شریعت کا میلان یہ ہو کہ اس کے حقوقِ ملکیت کو مقدار کے لحاظ سے محدود کر دیا جائے۔ یا انتفاع کے مواقع سلب کر کے ایک حد خاص سے زائد ملکیت کو آدمی کیلئے عملاً بیکار کر دیا جائے۔ (ص ۵۲-۵۳)

(۳) مزارعت، زمین کو بٹائی یا کرایہ پر دینا، کی حرمت اور خود کاشتی کی قید، اور ملکیتِ زمین کے لئے رقبہ کی حدبندی، اسلام کے مجموعی نظام میں کسی طرح ٹھیک نہیں بیٹھتی۔ (ص ۵۴)

خود ترجمان القرآن کی اسی اشاعت میں چند ہی صفحات آگے چل کر مودودی صاحب کا یہ فیصلہ بھی درج ہے کہ

اسلام ذرائع پیداوار کو قومی بنانے کے پروگرام کو بطور اصول کبھی اختیار نہیں کرتا۔ یہ چیز اسلام کے سارے اجتماعی نظام سے

مزاج کے خلاف ہے۔

ہم اس سے زیادہ اور کیا لکھیں کہ اس "دین" کا خدا ہی حافظ ہے جس کے علم برداروں کی یہ حالت ہو کہ جب ان کی مصلحتوں کا تقاضا ہو تو زمینداری اور جاگیرداری کو عین اسلام قرار دیدیں اور جب مصلحت اس کے خلاف ہو تو اسی زمینداری اور جاگیرداری پر لعنتیں بھیجنا شروع کر دیں۔ اور یہ سب اس لئے "تاکہ یہ جماعت

رائے عام کے میدان میں بھی لوگوں کی بڑی اکثریت کو اپنے گرد سمیٹ کر اپنی حریف تحریک کی بالکل مشکیں کس لے۔ یہی وہ اسکیم ہے جس پر جماعت اسلامی تسلسل سے کام کر رہی ہے۔ (ترجمان القرآن۔ بابت ستمبر ۱۹۵۲ء)

دیکھئے اپنا خریداری نمبر تلاش کیجئے!

اکتوبر ۱۹۵۴ء کی اس اشاعت کے ساتھ آپ حضرات کا چندہ (جن کے نمبر خریداری درج ذیل ہیں) ختم ہو گیا ہے لہذا آئندہ ماہ نومبر ۱۹۵۴ء کا پرچہ آپ کی خدمت میں وی پی بھیجا جائے گا۔ اگر آپ مناسب خیال فرمائیں تو ۲۰ اکتوبر ۱۹۵۴ء سے پہلے پہلے آپ اپنا چندہ بذریعہ منی آرڈر ارسال فرمادیں کہ اس میں ادارہ کو سہولت اور آپ کو کفایت ہے اور اگر کسی وجہ سے خدانخواستہ آپ رسالہ کی خریداری آئندہ جاری رکھنے کا ارادہ نہ رکھتے ہوں تو بھی ۲۰ اکتوبر سے پہلے پہلے ادارہ کو اپنے اس فیصلہ سے مطلع فرمادیں ورنہ ادارہ کی طرف سے مرسلہ وی پی کو وصول فرمانا آپ کا اخلاقی فریضہ ہوگا۔

فہرست خریداران جن کا چندہ ماہ اکتوبر کی اشاعت کے ساتھ ختم ہوا ہے۔

۷۶ – ۴۰۴ – ۵۹۰ – ۵۹۲ – ۱۱۳۰ – ۱۱۳۱ – ۱۱۳۲ – ۱۱۳۴ – ۱۱۳۶ – ۱۱۳۸ – ۱۱۳۹ – ۱۱۴۲ – ۱۱۴۸ – ۱۱۴۹ –
۱۱۵۱ – ۱۱۵۲ – ۱۱۵۴ – ۱۱۵۶ – ۱۱۶۱ – ۱۱۶۳ – ۱۱۶۷ – ۱۶۳۶ – ۱۶۳۹ – ۱۶۴۶ – ۱۶۵۰ – ۱۶۵۱ – ۱۶۵۲ – ۱۶۵۳ –
۱۶۵۵ – ۱۶۵۶ – ۱۶۵۷ – ۱۶۵۸ – ۱۶۵۹ – ۱۶۶۰ – ۱۶۶۱ – ۱۶۶۲ – ۱۶۶۳ – ۱۶۶۴ – ۱۶۶۵ – ۱۶۶۷ – ۱۶۶۸ – ۱۶۶۹ –
۱۶۷۲ – ۱۶۷۳ – ۱۶۷۴ – ۱۶۷۵ – ۱۶۷۹ – ۱۶۸۰ – ۱۶۸۱ – ۱۶۸۲ – ۱۶۸۳ – ۱۶۸۴ – ۱۶۸۵ – ۱۶۸۸ – ۱۶۸۹ – ۱۶۹۰ –
۱۶۹۱ – ۱۶۹۴ – ۱۶۹۵ – ۱۶۹۶ – ۱۶۹۹ – ۱۷۰۲ – ۱۷۰۳ – ۱۷۰۵ – ۱۷۱۴ – ۱۷۱۵ – ۱۷۱۷ – ۱۷۱۸ – ۱۷۱۹ – ۱۷۲۵ –
۱۷۲۶ – ۱۷۲۹ – ۱۷۳۲ – ۲۰۳۵ – ۲۰۷۸ –

طلوعِ اسلام کا پوسٹ بکس ۷۳۱۳ ہے

خط و کتابت میں پوسٹ بکس نمبر لکھنا نہ بھولئے تاکہ آپ کے خطوط ضائع نہ ہوں اور بروقت ہمیں مل جائیں۔ لہذا آئندہ خط و کتابت کیلئے پتہ یہ ہوگا:۔

ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام۔ پوسٹ بکس ۷۳۱۳۔ کراچی

نقد و نظر

(۱) غریب القرآن فی لغات القرآن مفردات القرآن پر امام راغب کی کتاب بڑی مشہور کتاب ہے اور ایک حد تک مفید بھی۔ مرزا ابوالفضل صاحب نے کم و بیش انہی خطوط پر قرآنی الفاظ کا یہ لغت اردو میں مرتب کیا ہے جس میں امام راغب کے علاوہ اور بہت سے مشہور لغات سے استفادہ کیا گیا ہے۔ الفاظ کی ترتیب صاف اور ان کے معانی مختصر ہونے کے باوجود واضح ہیں۔ مؤلف کے زاویۂ نگاہ کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ انھوں نے تفسیر کبیر اور سرسید احمد خاں کو بیشتر جگہ دی ہے جو حضرات قرآن کی مختصر سی لغت دیکھنا چاہتے ہوں ان کیلئے یہ کتاب مفید ثابت ہوگی۔ کتاب ٹائپ میں چھپی ہے اور قریب سوا چار سو صفحات پر مشتمل ہے قیمت اٹھارہ روپے۔ ملنے کا پتہ: ڈومینین بک کنسرن۔ بشیر باغ۔ حیدر آباد (دکن)

ایک چیز بڑی دلچسپ نظر پڑی۔ کتاب کی پیشانی پر یہ شعر درج ہے:

کردہ ام ایں نذر مولائے نجف گر قبول افتد زہے عز و شرف

لیکن اس سے پہلے صفحہ کے نیچے اس کا جواب بھی (غالباً غیر شعوری طور پر) موجود ہے۔

تو حقیقت را چہ دانی جاہلی تو گرفتار ابوبکرؓ و علیؓ

(۲) تاریخ فاطمینِ مصر مؤلفہ ڈاکٹر زاہد علی صاحب بی۔ اے۔ ڈی۔ فل (آکسن) وائس پرنسپل نظام کالج حیدر آباد دکن مطبوعہ دار الطبع جامعہ عثمانیہ۔ حیدر آباد دکن۔ کتابت و طباعت اور کاغذ عمدہ۔ ضخامت ۲۴۶ صفحات۔ قیمت مجلد مبلغ نو روپے چار آنے کلدار۔

طلوع اسلام کے اگست ۱۹۵۴ء کے شمارہ میں ڈاکٹر زاہد علی صاحب کی ایک کتاب "ہمارے اسمٰعیلی مذہب کی حقیقت اور اس کا نظام" پر تبصرہ[1] کیا جا چکا ہے۔ زیر نظر کتاب بھی ڈاکٹر صاحب موصوف ہی کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ اس کتاب میں ڈاکٹر صاحب نے "فاطمینِ مصر" کی تاریخ بیان کی ہے جو شیعہ فرقہ میں اسمٰعیلی شاخ کے مورثِ اعلیٰ مانے جاتے ہیں۔ تجارتی لائن میں ہمیں دن رات اسمٰعیلی برادری کے بہت سے افراد سے سابقہ پڑتا ہے لیکن ان کے عقائد اور تاریخ کے متعلق ہمارا علم نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے جس کی بڑی وجہ غالباً یہ ہے کہ جن اسمٰعیلی دوستوں سے ہمیں سابقہ پڑتا ہے وہ خود بھی اپنی تاریخ کے متعلق کچھ نہیں جانتے کہ ہمیں کچھ بتا سکیں۔ اسلئے ان کے متعلق ہماری معلومات زیادہ تر سنے سنائے قصوں اور افسانوں پر مبنی ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے علمی دنیا پر بڑا احسان کیا ہے کہ انھوں نے مسلمانوں کے اس اہم تجارتی فرقہ سے اسے روشناس کرایا اور ان کی پوری تاریخ ہمارے سامنے پیش کر دی ہے۔ موصوف چونکہ خود اسمٰعیلی فرقہ سے تعلق رکھتے ہیں

[1] اس کتاب کی قیمت مبلغ سات روپے کلدار ہے۔

اسلئے وہ اس سنگلاخ موضوع پر جسقدر کاوش کرسکتے تھے غالباً کوئی دوسرا آدمی نہیں کرسکتا تھا۔ انھوں نے خود اس فرقہ کے داعیوں اور نقیبوں کی تاریخی دستاویزوں اور یادداشتوں یا ان کی مذہبی تصانیف سے جسقدر قابل قدر مواد فراہم کردیا ہے وہ درخور تحسین ہے

جیسا کہ اس کتاب کے نام سے ظاہر ہے یہ خلفاء فاطمیین مصر کی تاریخ ہے مگر اس کے ساتھ ہی اس کتاب میں شیعی دعوت کے آغاز پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ چنانچہ شیعوں کے مختلف فرقوں کی مختصر تاریخ بھی اس میں آگئی ہے۔ خلفائے فاطمیین کا تعلق چونکہ شیعوں کے ایک خاص فرقہ اسماعیلیوں سے ہے اسلئے اس کتاب میں نہایت شرح وبسط کے ساتھ فرقۂ اسماعیلیہ کی تحریک کی کیفیت، درجہ بدرجہ اس کے آثار چڑھاؤ پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ عراق۔ ایران۔ شام مصر اور حرمین میں کامیابی کی کوئی صورت نہ دیکھتے ہوئے اولاً ان لوگوں نے یمن کو اپنا صدر مقام بنایا اور بنوامیہ کی حکومت کے خلاف اندرونی طور پر کارروائی کرتے رہے۔ اس وقت تک بنوعلی اور بنوعباس دونوں کی متحدہ کوششیں اموی خلافت کی بیخ کنی پر مرکوز تھیں اور یہ دونوں خاندان باہمی سمجھوتے کے ساتھ کام کررہے تھے لیکن مسلسل ناکامیوں کے بعد بالآخر ان لوگوں نے اپنی تحریک کیلئے بلادِ خراسان کو منتخب کیا جو پایۂ تخت دمشق سے کافی دور تھا اور جہاں کے لوگ اسلامی تعلیمات سے کماحقہ واقف نہیں تھے۔ اہل بیت کی محبت کے تصور پر تحریک کی بنیاد رکھی گئی۔ کامیابی کی کچھ صورتیں ابھر کر سامنے آنے لگیں تو بنوعباس اور بنوعلی میں اختلافات بھی ابھرنے شروع ہوگئے۔ خوبئ تقدیر سے بنوعباس کو ابومسلم خراسانی جیسا بااثر اور بارسوخ جرنیل مل گیا جس نے اموی سلطنت کا تختہ الٹ کر بنوعباس کی حکومت بغداد میں قائم کردی۔ اس کے بعد بنوعلی کی توجہات بنوامیہ کی مخالفت سے ہٹ کر بنوعباس کی مخالفت پر صرف ہونے لگیں مگر چونکہ بنوعباس اور بنوعلی ایک عرصہ تک متحدہ طور پر کام کرتے رہے تھے اسلئے انھیں اندرونی طور پر ان کے ہتھکنڈوں اور خفیہ مرکزوں کا اچھی طرح علم تھا اسلئے ان کی کوشش بارآور نہ ہوسکی۔ بالآخر انھیں ایک ایسے مقام کی تلاش ہوئی جو بغداد سے کافی دور ہو اور جہاں بربریت میں خراسان کا ہم پلہ ہو۔ چنانچہ اس مقصد کیلئے ان لوگوں نے بلادِ مغرب کو تاکا اور وہاں اپنے داعی بھیجنے شروع کردیئے۔ کچھ عرصہ کے بعد ان کو ایک ایسا داعی میسر آگیا جو ہر حیثیت سے ابومسلم خراسانی کا جواب تھا۔ ۲۸۰ھ میں ابوعبداللہ بلادِ مغرب میں پہنچا اور اپنی انتھک کوششوں اور سخت ترین جانفشانیوں سے قوم بربر کے ایک بڑے اور اہم قبیلہ کتامہ کو اپنا گرویدہ بنالیا۔ بلادِ مغرب کی فتح اسی داعی کی تبلیغ کا نتیجہ ورنہ اسی کی اولوالعزمی ان شہروں کی تسخیر کا سب سے بڑا سبب ہے۔ بالآخر ۸ ذی الحجہ ۲۹۶ھ کو ابوعبداللہ نے سلجماسہ کو فتح کرکے مہدی کو قید خانہ سے نکالا جو یہاں خلیفہ عباسی مکتفی باللہ کے حکم سے قید کردیا گیا تھا ابوعبداللہ نے تمام لوگوں سے مہدی کی بیعت لی اور ان کا ایک جلوس نکالا خود ابوعبداللہ رؤساء قبائل کے ساتھ مہدی کے سامنے پیدل چلا۔ اس کی طرف اشارہ کرکے یہ کہتا جاتا تھا کہ "یہ تمہارے مولیٰ ہیں۔ یہی وہ مہدی ہیں جن کی طرف میں تم کو دعوت دیتا تھا" بلادِ مغرب پر مہدی کا تسلط اچھی طرح قائم ہوجانے کے بعد افسوس ہے کہ خود ابوعبداللہ کا حشر بھی اس سے کچھ بہتر نہ ہوا جو ابومسلم خراسانی کا حشر بنوعباس کے ہاتھوں ہوچکا تھا۔ چنانچہ صرف دو سال کے بعد مہدی نے ۲۹۸ھ میں ابوعبداللہ کو قتل کردیا۔ یوں فاطمیین کی حکومت بلادِ مغرب میں قائم ہوئی۔ مہدی کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا قائم بامراللہ اور پھر قائم کا بیٹا منصور باللہ اور اس کے بعد اس کا بیٹا المعز لدین اللہ ۳۴۱ھ میں خلیفہ ہوا یہ وہ زمانہ تھا جبکہ خلافت عباسیہ انتہائی کمزور

ہو چکی تھی اور خلفائے بنو عباس بویہی سلاطین کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنے ہوئے تھے۔ خلیفہ معز نے موقعہ کو غنیمت جانا اور ۳۵۸ھ میں مصر پر حملہ کر کے اسے فتح کر لیا اور ۳۵۹ھ میں مصر کے مشہور شہر "قاہرہ معزیہ" کی بنیاد رکھی گئی جسے "المعز لدین اللہ" نے ۳۶۲ھ میں دولت فاطمین کا پایۂ تخت قرار دیا۔

خلفائے فاطمین کا جو نقشہ اس تاریخ سے ہمارے سامنے آتا ہے وہ عجیب و غریب ہے۔ مثلاً حاکم کے متعلق کتاب مذکور میں لکھا گیا ہے کہ

> سب سے پہلے اس نے یہ حکم نافذ کیا کہ کوئی شخص مجھے سیدنا و مولانا کے الفاظ سے خطاب نہ کرے صرف امیر المومنین پر اکتفا کرے۔ اس حکم کی خلاف ورزی میں قتل کی سزا مقرر کی گئی لیکن ۳۹۰ھ اور ۴۱۱ھ کے درمیان حاکم سے عجیب غریب افعال و احکام صادر ہوئے جن کی وجہ سے اکثر مورخین نے اسے فاتر العقل اور مجنون ٹھہرایا ہے۔ منجملہ ان افعال کے شب کا کاروبار ہے۔ اکثر راتوں کو حاکم سوار ہو کر باہر نکلتا اور دربار منعقد کرتا تھا۔ عام لوگوں کو بھی یہ حکم دیا گیا تھا کہ وہ اپنا کاروبار رات ہی کو کریں۔ دکانیں رات کو کھلتی تھیں اور روشنی کی جاتی تھی۔ غرض رات دن سے بدل گئی اور وہ معیوب باتیں جو راتوں کو در پردہ ہوتی تھیں دن دہاڑے ہونے لگیں۔ لہو و لعب زیادہ ہو گیا۔ جب تماشا دیکھنے کیلئے عورتیں باہر نکلنے لگیں تو ان کے روکنے کیلئے سخت احکام صادر کئے گئے تاکہ شام کے وقت وہ اپنے گھروں ہی میں رہیں۔ رات کے دربار کا سلسلہ ۳۹۱ھ سے لیکر ۳۹۳ھ تک یعنی تین سال برابر جاری رہا۔ اس کے بعد حاکم نے اسے موقوف کر دیا اور یہ حکم صادر کر دیا کہ رات کو کوئی شخص باہر نہ نکلے۔ ۳۹۳ھ میں جرجیر (حضرت عائشہؓ کی مرغوب ترکاری) متوکلیہ (متوکل عباسی خلیفہ کی پسندیدہ ترکاری) اور ملوخیہ (امیر معاویہؓ کی مرغوب ترکاری) کے متعلق ایک فرمان صادر کیا کہ ان ترکاریوں کا استعمال ممنوع ہے۔ جو شخص ان کی خرید و فروخت کریگا یا انہیں کھلائے گا اسے سخت سزا دی جائیگی . . . . بعض قسم کی مچھلیاں مثلاً دنیس (غیر فلس دار مچھلیاں) اور بدبودار ترمس حرام کی گئیں۔ جتنے مچھلی پکڑنے والے تھے ان سے سخت عہد و پیمان لیا گیا کہ وہ اس قسم کی مچھلیاں نہ پکڑیں اور نہ بیچیں۔ ان احکام کی جس نے خلاف ورزی کی اس کی گردن مار دی گئی۔ شراب نوشی کو بہت سختی سے روکا گیا۔ شراب بنانے والوں کے متعلق یہ حکم جاری کیا گیا کہ وہ انگور ہی نہ خریدیں تاکہ وہ شراب تیار نہ کر سکیں۔ انگور کی ہزاروں بیلیں کاٹ ڈالی گئیں۔ شہد کے پانچ ہزار مٹکے نہر نیل میں الٹ دیئے گئے تاکہ شہد سے بھی شراب نہ بنائی جائے . . . . شطرنج اور مہرے وغیرہ جس قدر مل سکتے تھے ان سب کو ایک جگہ جمع کر کے آگ کی نذر کیا گیا . . . . خواہ رات کا وقت ہو یا دن کا عورتوں کا گھر سے نکلنا ہی بند کر دیا گیا۔ موچیوں کو ہدایت کی گئی کہ وہ عورتوں کے جوتے ہی نہ بنائیں۔ یہاں تک ان پر پابندی عائد کی گئی کہ وہ مکانات کے دریچوں سے بھی اپنے سر باہر نہ نکالیں . . . . ۳۹۵ھ سے حاکم نے اہل کتاب کے ساتھ رواداری کا سلوک چھوڑ دیا اور ان پر بے جا سختیاں شروع کیں۔ انہیں تین باتوں میں سے کوئی ایک بات اختیار کرنے پر مجبور کیا گیا۔ یا تو وہ اسلام قبول کریں۔ یا مملکت فاطمیہ سے نکل کر دوسرے ملک میں چلے جائیں۔ یا اگر نصاریٰ ہوں تو کالا لباس پہنیں جو بنو عباس کا شعار تھا اور اپنی گردنوں میں ایسی وزنی صلیبیں ڈالیں جو ایک ذراع لانبی اور ایک ذراع چوڑی ہوں اور جن کا وزن تقریباً پانچ رطل ہو۔ یہ صلیبیں ان کے کپڑوں کے اوپر نظر آتی ہوں۔ انہیں اپنی مذہبی عیدیں، مثلاً عید صلیب، عید غطاس وغیرہ منانے کی ممانعت کر دی گئی۔ ان موقعوں پر جو تماشے ہوا کرتے تھے وہ موقوف کر دیئے گئے۔

اگر یہود ہوں تو انھیں یہ حکم دیا گیا کہ جب وہ باہر نکلیں تو پیلے رنگ کے عمامے اپنے سروں پر باندھیں اور اپنی گردنوں میں لکڑی کی بنی ہوئی گائے کے بچھڑے کی شکلیں ڈالیں جن کا وزن پانچ رطل ہو اور جو ان کے لباس پر نظر آتی ہوں۔ . . . . نصاریٰ کے حماموں پر صلیب اور یہود کے حماموں پر گائے کے بچھڑے کی شکلیں لٹکائی گئیں۔ . . . . ۳۹۱ھ میں بلادِ شام میں ایک آدمی گرفتار کیا گیا جو یہ کہتا تھا کہ میں حضرت علیؓ کو نہیں پہچانتا۔ اس نے قاضی القضاۃ حسن بن نعمان کے سامنے بھی یہی بیان دیا۔ قائد القواد حسین بن جوہر نے اسے بہت سمجھایا مگر وہ نہ مانا۔ حاکم نے اسے قتل کرنے کا حکم دیا پھر اس کی لاش سولی پر چڑھائی گئی۔ ۳۹۳ھ میں تیرہ آدمی گرفتار کیے گئے جنھوں نے صلوٰۃ الضحیٰ پڑھی تھی۔ یہ لوگ پٹوائے گئے اور شہر میں اونٹوں پر تشہیر کرائے جانے کے بعد انھیں تین دن کی قید کی سزا دی گئی۔ تراویح کی نماز موقوف کر دی گئی۔ ۳۹۵ھ میں دکانوں، مکانوں، اور قبرستانوں کے دروازوں پر سب السلف لکھوایا گیا۔ اہل سنت اپنے مکانوں پر رنگین اور منقش تحریروں میں اپنے بزرگوں پر لعنت ملامت لکھوانے پر مجبور کیے گئے۔ ایک دفعہ حاجیوں کا قافلہ مصر میں اترا۔ انھیں سب السلف پر مجبور کیا گیا۔ ان کے رکنے پر ان کی بے عزتی کی گئی۔ اکثر لوگ دعوت اسماعیلیہ میں جبراً داخل کیے گئے۔ (ص ۱۸۷ تا ۱۹۳)

ان خلفاء کے تمول اور شان و شوکت کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ مختصر طور پر تاریخ نے جو کچھ محفوظ رکھا ہے وہ یہ ہے:۔

معز جب بلادِ مغرب سے اپنا پایۂ تخت منتقل کر کے مصر روانہ ہوا تو اس کے ساتھ ڈھیروں سونا تھا۔ کہتے ہیں کہ اس نے دینار پگھلا کر ان کی چکیاں بنوائیں اور ان کو سواریوں پر لاد کر اپنے ساتھ مصر لے گیا۔

معز کی دو بیٹیوں کا بیش بہا ترکہ | معز کے مصر میں پہنچنے کے بعد فاطمین کا تمول آئے دن بڑھتا گیا اس کی ایک بیٹی عبدہ کا ۴۴۳ھ میں انتقال ہوا تو اس کے ترکہ میں پانچ زمرد کی تھیلیاں اور مختلف قسم کے قیمتی جواہرات کے علاوہ چار سو صندوق جس میں خالص چاندی کے کام کے تین ہزار برتن تھے۔ تیس ہزار قطعے صقلی زردوزی اور کارچوبی کے۔ نوے طشت اور نوے لوٹے خالص بلور کے۔ چار سو تلواریں جن پر سونے کا پانی چڑھا ہوا۔ سترہ مثقال کا ایک سرخ یاقوت غرضکہ یہ سب بیش بہا سرمایہ نکلا۔ مرحومہ کے حجروں اور صندوقوں پر مہر کرنے میں چالیس پونڈ موم خرچ ہوتا تھا اور اس کے مال و اسباب پر لیبل لگانے کیلئے کاغذ کے تیس بستوں (دستوں؟) کی ضرورت پڑتی تھی۔ معز کی دوسری لڑکی رشیدہ کا انتقال اسی سال ہوا۔ اس کے مال و اسباب کی قیمت کا اندازہ ستائیس لاکھ دینار کے لگ بھگ کیا گیا اس کے علاوہ بارہ ہزار رنگ برنگ کے کپڑے کافور قصری سے بھرے ہوئے سو صندوق۔ سر پر ڈالنے کے جواہر دوزکی رومال برآمد ہوئے۔

خود معز نے دنیا کا ایک نقشہ سونے اور مختلف رنگوں کا شہر تستر (ایران) میں بائیس ہزار دینار کی لاگت سے تیار کرایا۔ اس کی بیوی تعزیہ نے قرافہ میں ایک مسجد سنگ مرمر کے ستونوں کی بنوائی جس کی آرائش میں بڑی رقمیں صرف کی گئیں۔ چھت کی بہترین نازک نقاشی کی نفاست آپ اپنا جواب تھی۔

قصر شرقی (کبیر) میں سونے کا محل اور سونے کا تخت | قصر شرقی کی بنیاد قائد جوہر نے معز کے حکم سے ڈالی تھی اس کی بڑی تعریف کی گئی ہے۔ یہ بستان کافوری سے متصل تھا۔ اس کی وسعت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ اس میں تقریباً چار ہزار قطعے تھے جن میں ہر قطعہ قصر یا محل کہا جاتا تھا۔ ان محلات کے مجموعوں کا نام قصر کبیر تھا۔ اس میں ایک سونے کا محل تھا جسے قصر الذہب

بکتے تھے۔ اس کا دروازہ بھی سونے کا تھا۔ اس میں ایک شامیانے کے نیچے سونے کا تخت تھا جس پر خلفا جلوہ نما ہوتے تھے۔ تخت کے سونے کا وزن ایک لاکھ دس ہزار مثقال بتایا جاتا ہے۔ مستنصر کے زمانے میں اس کے سامنے کے ایک پردے میں ایک ہزار پانچسو ساٹھ مختلف رنگوں کے ہیرے جڑے گئے اور تقریباً تین لاکھ مثقال خالص سونا استعمال کیا گیا۔ اس کے علاوہ ایک دوسرا محل قصر زمرد تھا جس کے ستون سنگ مرمر کے تھے اور اس کے ایک عالیشان دالان میں خلیفہ دوشنبہ اور پنجشنبہ کو بیٹھتا تھا۔ اب ان محلات کا کوئی نشان باقی نہیں۔ ان کی جگہ سوق النحاسین اور خان الخلیلی دو بازار قائم ہو گئے ہیں۔

کعبے کا پردہ | معز نے خلافتِ عباسیہ کے پردے سے بہت بڑا ایک چوکور سرخ ریشمی پردہ (شمسہ) ایک سو چوالیس بالشت لمبا تیار کرایا تھا۔ اس کے گرد سونے کے بارہ چاند اور ہر چاند میں سونے کا ایک ایک ترنج اور ہر ترنج میں کبوتر کے انڈے کے برابر پچاس پچاس موتی ٹانکے گئے تھے۔ اس کے علاوہ سرخ، پیلے اور نیلے رنگ کے جواہرات بھی لگائے گئے تھے۔ اس کے گرد زمردی حروف میں حج کی آیتیں لکھوائی گئی تھیں جن کے اطراف جواہر دوزی کی گئی تھی۔ یہ پردہ مشک سے بسا رہتا اور قصر میں نمائش کیلئے رکھا گیا تھا۔

عزیز کو جواہرات اور نادر چیزیں جمع کرنے کا شوق | عزیز کو جواہرات اور نوادر جمع کرنے کا بہت شوق تھا۔ ان کے فراہم کرنے میں بڑی بڑی رقمیں صرف کی گئیں۔ ہتھنیاں۔ گینڈے اور دوسرے عجیب قسم کے جانور جو پہلے مصر میں نایاب تھے افریقہ کے دوسرے شہروں سے لائے گئے۔ سونے کا محل۔ شامیانے اور سونے کا تخت یہ سب چیزیں عزیز ہی کے زمانے کی ہیں۔ جامع حاکم جس کی بنیاد عزیز نے رکھی۔ جامع قرافہ اور دوسرے محلات خاص کر قصر البحر جس کی شان میں ابن خلکان یہ کہتا ہے کہ اس کی نظیر نہ شرق میں پائی جاتی تھی نہ غرب میں۔ عزیز کی ثروت کا پتا دیتے ہیں۔ عزیز ہی کے عہد سے فوج کے سواروں نے مراسم کے موقعوں پر سنہری زینوں کا استعمال شروع کیا۔

حاکم اور اس کی بہن ست الملک کی ثروت | حاکم نے بھی اپنے ترکے میں بہت مال چھوڑا۔ اسے بھی اپنے بزرگوں کی طرح اپنی شان و شوکت دکھانے کا بڑا شوق تھا۔ جب اسے یہ خبر پہنچی کہ قیصر قسطنطنیہ کا ایلچی مصر آنے والا ہے تو اس نے قصر کی آرائش کا حکم دیا۔ قصر کی دیواریں ریشمی زریں کپڑوں سے آراستہ کی گئیں۔ تمام ایوان سونے سے جگمگانے لگا۔ ایوان کے آگے سونے کا ایک قطعہ "ورقہ" کی شکل کا جواہرات سے مرصع رکھا گیا۔ سورج کی شعاعیں جب اس پر گر کر منعکس ہوتیں تو ان کی روشنی سے اطراف کی چیزیں چمک اٹھتی تھیں۔ حاکم کی بہن کے محل سے آٹھ سو لونڈیاں۔ مشک سے بھرے ہوئے آٹھ مرتبان۔ بہت سے جواہرات جن میں ایک یاقوت آٹھ مثقال کا تھا نکلے اس کی سالانہ آمدنی پچاس ہزار دینار تھی۔ یہ اپنے حلم اور کرم میں مشہور تھی۔ (ص ۱۷۰-۱۷۱)

کتاب کے آخر میں اسماعیلی مذہب کے متعلق بھی بڑا قیمتی مواد جمع کیا گیا ہے مثلاً اسماعیلیوں کے مخصوص مذہبی علوم پر بحث کرتے ہوئے تاریخ فاطمین مصر میں لکھا ہے کہ

اسماعیلیوں کے مخصوص مذہبی علوم تین بڑے حصوں پر مشتمل ہیں۔ (۱) طالب علم کو پہلے فقہ کی تعلیم دی جاتی ہے۔ . . . فقہ کی کتابوں میں شرعی احکام کے ساتھ ساتھ ان کی اسناد بھی قلم بند کر دی گئی ہیں اسماعیلی فقہ میں قیاس اور رائے کو بالکل دخل نہیں۔

اجتہاد گمراہی کا راستہ ہے۔ ہر شرعی حکم نص قطعی کا محتاج ہے۔ (۲) فقہ کے بعد شرعی احکام کی تاویل سکھائی جاتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ علم تاویل کو علم باطن بھی کہتے ہیں۔ ان میں جو اسرار ہیں وہ عوام کو نہیں بتائے جاتے۔ اسماعیلیوں میں بھی جو ایک خاص درجے کو پہنچتا ہے وہی ان پر مطلع ہو سکتا ہے۔ لیکن خوش قسمتی سے داعی ناصر خسرو کی کتاب "وجہ دین" جو تاویل میں لکھی گئی ہے چھپ چکی ہے۔ (۳) تاویل کے بعد مذہبی فلسفے کی تعلیم شروع ہوتی ہے جسے اسمٰعیلی اپنی اصطلاح میں حقیقت کہتے ہیں۔ اس فن میں عالم کی ابتدا انتہا، رسالت، وصایت، امامت، قیامت، بعث اور حشر وغیرہ کے مسائل بیان کئے گئے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ شیعوں کے تمام فرقے تاویل کے قائل ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن جس فرقے نے اس فن کو ترقی دی اور خاص طور پر تمام احکام عبادات اور قصص انبیا کی تاویلوں کے متعلق مستقل کتابیں لکھیں وہ اسماعیلیہ ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تاویل کو شریعت کی حکمت، دین کا راز اور علم روحانی بھی کہتے ہیں جس کی تعلیم کے لئے ہر نبی اپنا ایک وصی مقرر کرتا ہے۔ نبی کا فریضہ یہ ہے کہ وہ لوگوں کو شریعت کے ظاہری احکام بتائے اور وصی کا کام یہ ہے کہ وہ ان کو ان کی تاویلوں سے آگاہ کرے۔ (صفحہ ۴۶۹ - ۴۷۱)

اس کے بعد قابل مولف نے اسماعیلی کتابوں سے اس تاویل اور باطنی علم کے کچھ نمونے پیش کئے ہیں۔ جن میں سے ہم کچھ منتخب نمونے پیش کرتے ہیں۔

ظاہر یا مثل	باطن یا ممثول
وضو	حضرت علیؓ کا اقرار کرنا۔ کیونکہ وضو اور علی ہر ایک لفظ میں تین حرف ہیں۔
نماز پڑھنا۔	داعی کی دعوت میں داخل ہونا۔
قبلہ کی طرف متوجہ ہونا۔	امام کی طرف متوجہ ہونا۔
ظہر کی نماز	رسولؐ خدا کی دعوت میں داخل ہونا۔
عصر کی نماز	حضرت علیؑ یا صاحب القیامہ کی دعوت میں داخل ہونا۔
مغرب کی نماز	آدم کی دعوت میں داخل ہونا۔
عشا کی نماز	چار نقیبوں کی دعوت میں داخل ہونا۔
فجر کی نماز	مہدی اور ان کی حجت کی دعوت میں داخل ہونا۔
ماہ رمضان	امام محمد بن اسماعیل کیونکہ یہ امام حضرت رسولؐ خدا سے نویں امام ہیں جیسا کہ رمضان نواں مہینہ ہے۔
ماہ رمضان کے روزے رکھنا	شریعت کا باطنی علم اہل ظاہر سے چھپانا۔
ماہ رمضان کے تیس دن	حضرت علیؑ اور امام مہدی کے درمیان دس امام، دس حجتیں اور دس ابواب ہیں۔
لیلۃ القدر	خاتم الائمہ کی حجت۔ یا حضرت فاطمہؑ۔
زکوٰۃ ادا کرنا	استاد کا شاگرد کو پڑھانا۔

بیت اللہ کا مقصد	امام کی طرف متوجہ ہونا۔
کعبہ	حضرت رسول خدا صلعم
باب کعبہ	حضرت علیؓ
حجرِ اسود	امام زمان کی وہ حجت جو ان کے بعد امام ہو۔
خانۂ کعبہ کا سات بار طواف کرنا	سات اماموں کے احکام کی پیروی کرنا جن میں ساتواں قائم ہوتا ہے۔
صفا و مروہ	حضرت رسول خدا صلعم اور حضرت علیؓ

اس کے بعد اسماعیلیوں کا مذہبی فلسفہ بیان کیا گیا ہے جو ماورا الطبیعیات سے متعلق ہونے کی وجہ سے دقیق ہو گیا ہے اس لئے اس کا نمونہ پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔

کتاب نہایت عمدگی سے ترتیب دی گئی ہے۔ اور جو بات لکھی گئی ہے اس کے مستند ماخذوں کا حوالہ بقید صفحات فٹ نوٹ میں دیدیا گیا ہے۔ تاریخی اور علمی ذوق رکھنے والے حضرات کیلئے یہ کتاب بیش بہا معلومات کا ذخیرہ ہے۔

۳۔ ملا کا اختلاف اللہ سے

شائع کردہ دار القرآن ٹھٹہ (سندھ) ملنے کا پتہ: محمد صبیح صاحب بی۔ اے۔ بی۔ ایل ایڈووکیٹ ٹھٹہ۔ (سندھ)۔ قیمت کچھ نہیں محصول ڈاک بھیجنے پر مفت بھیجا جا سکتا ہے۔

یہ چھوٹا سا اڑتالیس صفحہ کا پمفلٹ ہے جو دار القرآن ٹھٹہ نے شائع کیا ہے جو ایک مکالمہ کی شکل میں لکھا گیا ہے۔ موضوع مکالمہ یہ ہے کہ مولوی صرف خدا ہے اسلئے کسی کو مولانا جیسے القاب سے خطاب نہیں کرنا چاہئے۔ اس کے ضمن میں اور بھی بہت سی کار آمد باتیں آ گئی ہیں۔ یہ پمفلٹ پڑھنے کے لائق ہے اور دار القرآن ٹھٹہ اپنی اس تبلیغی سعی میں قابل مبارکباد ہے۔ طرز بیان اگر اور زیادہ شگفتہ ہوتا اور کتابت و طباعت کا معیار ذرا بلند ہوتا تو زیادہ بہتر تھا۔ ارباب ذوق محض محصول ڈاک کے بقدر ٹکٹ بھیجکر مفت طلب فرما سکتے ہیں اور اگر کوئی صاحب اسے چھپوا کر مفت تقسیم کرنا چاہیں تو اس کی بھی اجازت ہے۔

سلیم کے نام خطوط

ان خطوط میں ملت کے اس نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کو مخاطب کیا گیا ہے جو شرق و مغرب کے تصادم کے بعد دورِ ملوکیت کے وضع کردہ غلط مذہبی تصورات سے متنفر ہوتے ہوئے اسلام اور اس کے سرچشمۂ حیات قرآن سے بھی ہاتھ دھو چلا تھا۔ عقائد و نظریات جیسے خشک اور نازک مسائل پر اس عمدگی سے بحث کی گئی ہے کہ محسوس ہی نہیں ہوتا کہ ہم کسی خشک فلسفیانہ بحث کو پڑھ رہے ہیں۔ باتوں باتوں میں وہ دقیق اور معرکہ آرا مسائل حل کر کے رکھ دیئے گئے ہیں جنھیں ضخیم مجلدات میں بھی حل نہیں کیا جا سکا تھا۔ خطوط ملک کے گوشہ گوشہ سے خراجِ تحسین وصول کر چکے ہیں۔ قرآن کی روشنی اور محترم پرویز صاحب کا بصیرت افروز قلم ——— بڑا سائز۔ ضخامت قریب سوا چار سو صفحات۔ کتابت و طباعت دیدہ زیب، کاغذ سفید۔ گرد پوش مصور مشرق جناب چغتائی کے حسین قلم کا مرقع۔ قیمت چھ روپے علاوہ محصول ڈاک۔

ناظم ادارۂ طلوع اسلام۔ پوسٹ بکس ۷۳۱۳۔ کراچی

ہمارا اور آپ کا مشترکہ مفاد

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے طلوع اسلام نے آجتک نہ کسی سے مالی مدد مانگی ہے، نہ اب مانگ رہا ہے۔ البتہ اس کی ایک اسکیم ہے جس کی رو سے آپ اسے ایک پیسہ بھی مفت نہیں دیتے لیکن اسے قرآنی لٹریچر کی اشاعت میں سہولت بہت ہو جاتی ہے۔ اسکیم یہ ہے کہ اگر آپ ایک سو روپیہ (یکمشت یا چار مساوی ماہانہ قسطوں میں) ادا کر دیں تو آپ کا حساب کھول لیا جائے گا اور اس حساب میں ہم آپ کو رسالہ طلوع اسلام اور اس کی شائع کردہ کتابوں میں سے جو بھی آپ کو مطلوب ہوں بھیجتے چلے جائیں گے تا آنکہ آپ کا ایک سو روپیہ پورا ہو جائے۔ اس کے بعد آپ پھر اسی طرح پیشگی روپیہ جمع کرا سکتے ہیں۔ اگر ہم کسی وجہ سے اس سلسلہ کو جاری نہ رکھ سکیں تو آپ کا بقایا روپیہ آپ کو واپس کر دیا جائے گا۔

یہ اسکیم قریب ایک سال سے جاری ہے اور اس عرصہ میں ہم ایک درجن سے زائد کتابیں شائع کر چکے ہیں۔ ماہ جولائی ۵۴ء تک پیشگی خریداروں کی تعداد ۲۳۵ تک پہنچ گئی تھی مگر اب اس کی رفتار بہت ہی سست پڑ گئی ہے اس کی طرف ناظرین کو خاص طور پر متوجہ ہونے کی ضرورت ہے۔ ایک درجن کے قریب کتابیں شائع ہونے کے لئے رکھی ہوئی ہیں جن میں "قرآنی نظامِ ربوبیت" اور معارف القرآن کی سابقہ جلدیں جواب نایاب ہیں۔ نیز معارف القرآن کی پانچویں جلد جیسی ضخیم کتابیں بھی شامل ہیں۔ آپ خود ہی غور فرمائیے کہ اس سلسلہ میں آپ کا کیا فرض ہے۔

اگر آپ ابھی تک "پیشگی خریداران" کی اسکیم میں شامل نہیں ہوئے تو اس پر غور فرمالیجئے کہ اس اسکیم کی رو سے آپ ایک پیسہ بھی زائد نہیں دیں گے اور قرآنی فکر کی نشر و اشاعت میں ہمیں بہت آسانی ہو جائے گی۔ بات صرف اتنی ہے کہ آپ قیمت پیشگی دیتے ہیں۔

ناظم ادارۂ طلوع اسلام۔ پوسٹ بکس ۷۳۱۳ کراچی

رفتار عالم

جینوا کانفرنس کو اگر کامیاب کہا جائے تو اس کی کامیابی اس سے زیادہ نہیں کہ ہندچینی میں جنگ بند ہوگئی ہے۔ اس سے حقیقی جنگ کا قلع قمع نہیں ہوا بلکہ وہ ایک نئے دور میں داخل ہوگئی ہے۔ دول عظمیٰ کی سیاست اسقدر جنگجویانہ ہوچکی ہے کہ ان کی گفتگوئے امن بھی جنگ کی ایک صورت ہوتی ہے۔ چنانچہ ہندچینی میں جنگ کیا بند ہوئی ایشیا اور یورپ دونوں میں ہلچل مچ گئی۔ جینوا کانفرنس اور اس سے پیشتر برلن کانفرنس میں بھی روس کی انتہائی کوشش یہی تھی کہ اقوام مغرب کو متحد و متفق نہ ہونے دیا جائے۔ ان اقوام میں باہمی اختلاف کی نوعیت بھی کچھ ایسی تھی کہ ان کا ابھارنا کچھ مشکل کام نہیں تھا۔ یورپ میں سب سے سنگین مسئلہ جرمنی کا ہے۔ مشرق و مغرب میں جرمن معاہدہ امن پر اتفاق نہ ہوسکنے سے جرمنی دو حصوں میں منقسم ہوگیا۔ جنگ کے خاتمہ سے لیکر اب تک فریقین جرمن وحدت کا دم بھرتے چلے آرہے ہیں لیکن اسکی کوئی عملی شکل پیدا نہیں ہوسکی۔ اقوام مغرب نے یہ صورت حال دیکھکر جمعیت یورپ (ای۔ ڈی۔ سی) کا خاکہ تیار کیا۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ شمالی اوقیانوسی دفاعی تنظیم (ناٹو) سے جرمنی کو متعلق کیا جائے تاکہ ایک تو مسلح جرمن فوجیں ان کے کام آسکیں دوسرے جرمنی کے پھر ایکبار ابھرنے اور یورپ کو تہ و بالا کرنے کے امکانات ختم ہوجائیں۔ یہ صورت تھی تو مناسب لیکن فرانس کو یہ ڈر تھا کہ اگر جرمن قوم کو مسلح ہونے کی اجازت مل گئی تو اس کے فرانس پر غلبہ حاصل کرنے کا دروازہ کھل جائیگا۔ اسکی طرف سے یہی کوشش رہی کہ جرمن اسلحہ بندی کی جو بھی صورت اختیار کی جائے اس میں امریکہ بالعموم اور برطانیہ بالخصوص پوری طرح شریک ہو تاکہ فرانس کو یہ اطمینان حاصل ہوجائے کہ جرمنی اسے ایک بار روند نہیں ڈالے گا۔ امریکہ اور برطانیہ پوری طرح تو شریک نہ ہوئے لیکن انھوں نے حتی الامکان فرانس کو یقین دلایا کہ چونکہ ای۔ ڈی۔ سی بالآخر ناٹو کے ماتحت ہوگی اور ناٹو میں وہ دونوں شریک ہیں اسلئے جرمنی آزادانہ طور پر فرانس کو نگل نہیں سکے گا۔ فرانس کی اس سے تشفی نہیں ہوئی اور وہ ای۔ ڈی۔ سی کی تصدیق کے لئے آمادہ نہ ہوا۔ اس طرح ستائیس مہینے گذر گئے اور جمعیت یورپ کا منصوبہ جوں کا توں پڑا رہا۔

جمعیت یورپ

جینوا کانفرنس کے بعد فرانس ہندچینی سے فارغ ہوا تو توقع پیدا ہوگئی کہ اب وہ یورپی مسئلہ کی طرف کما حقہ توجہ دے سکیگا۔ مینڈیس فرانس نے بڑی ہمت سے اسمبلی میں ای۔ ڈی۔ سی پر بحث کے آغاز کیلئے ۲۴ اگست کی تاریخ مقرر کردی اور معاہدہ مذکور کو ارکان اسمبلی کیلئے قابل قبول بنانے کیلئے برسلز میں معاہدین کی ایک کانفرنس کا انتظام کیا۔ اس کانفرنس میں انھوں نے بہت کوشش کی کہ معاہدہ میں ایسی ترمیمات منظور ہوجائیں جس سے اس کی منظوری آسان ہوجائے لیکن بقیہ اقوام نے انھیں منظور نہیں کیا اور اصرار کیا کہ معاہدہ علی حالہ منظور ہونا چاہیے۔ فرانسیسی اسمبلی نے حسب توقع معاہدہ کو مسترد کردیا جس سے ای۔ ڈی۔ سی کا منصوبہ خاک میں مل گیا۔ اس سے تمام مغربی حکومتوں میں کھلبلی مچ گئی اور قلوب و اذہان کا رخ ادھر مڑ گیا کہ اس خلا کو کیسے پر کیا جائے۔ امریکہ اور برطانیہ اس سے پیشتر ہی ایک خاکہ تیار کرچکے تھے۔ آئزن ہاور اور چرچل نے اپنی ملاقات میں یہ فیصلہ کیا تھا کہ اگر ای۔ ڈی۔ سی ناکام ہوجائے تو جرمنی کو مشروط طور پر آزاد کرکے براہ راست ناٹو سے منسلک کرلیا جائے۔ فرانس کو اس تجویز سے اتفاق نہیں ہوسکتا کیونکہ وہ جرمنی کی اسلحہ بندی (بغیر پوری ضمانت کے) تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں۔ اس کی طرف سے یہ تجویز سامنے آئی ہے کہ معاہدہ ای۔ ڈی۔ سی (جمعیت یورپ) کو مقابلۃً کم متصلب بنایا جائے۔ اور برطانیہ کو بھی اس میں شریک کرکے "وسیع تر ای۔ ڈی۔ سی" یا "کمتر ناٹو" کی شکل دیدی جائے۔ اس تجویز میں کوئی نئی بات نہیں اور امریکہ اور برطانیہ اسے ماننے کیلئے تیار نہیں ہوسکتے۔ فرانس کے فیصلے نے جرمنی میں نہ محض بے صبری پیدا کردی ہے بلکہ چانسلر اڈینائر کی حیثیت مخدوش بنادی ہے۔ تقسیم اور عدم معاہدہ نے جرمن قوم میں جو بدمزگی اور غیظ و غضب کے جذبات پیدا کر رکھے ہیں انھیں ابتک اڈینائر نے ہی قابو میں رکھا ہے۔ وہ اس امید میں ان کو سنبھالے چلے آرہے تھے کہ انھیں آزادی بھی مل جائیگی اور اسلحہ بندی کی اجازت بھی۔ لیکن فرانس نے آجتک اس کی عملی صورت پیدا

نہیں ہونے دی۔ اب ایڈنا کی حیثیت کمزور ہوگئی ہے۔ گو ابھی تک ایسے آثار نہیں لیکن ہو سکتا ہے کہ کسی وقت جرمنی کو سنبھالنا ان کے بس کی بات نہ رہے اس لئے امریکہ اور برطانیہ یہ چاہتے ہیں کہ جرمنی کے صبر کا مزید امتحان نہ لیا جائے۔ ایڈنا نے اپنی طرف سے جو مطالبہ پیش کیا ہے وہ یہ ہے کہ مغربی جرمنی کو غیر مشروط طور پر آزاد کر دیا جائے اور ناٹو کا پورا اور مساوی رکن بنا لیا جائے۔ یہ تجویز فرانس کے نزدیک ناقابل قبول ہے اور امریکہ اور برطانیہ بھی فرانس کی ناراضی کی ڈر سے اسے منظور نہیں کریں گے۔ یورپ کی تنظیم نو کی قیادت اس وقت برطانیہ کے ہاتھ میں آگئی ہے۔ لندنی تجویز اس قسم کی نظر آتی ہے کہ جرمنی کو ناٹو کا رکن بنا لیا جائے اور اسکی غیر معمولی اسلحہ بندی کے خلاف پوری ضمانت دیدی جائے۔ اس سلسلہ میں قائدین مغرب مضطربانہ بھاگ دوڑ میں مصروف ہیں۔ برسلز، لندن، پیرس، بون مذاکرات کے مراکز ہیں۔ برطانیہ نے بالینڈ، بلجیم اور لکسمبرگ کو اپنے نظریئے کا قائل کر لیا ہے۔ اس نے ستمبر کے آخر میں نو قومی کانفرنس طلب کی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ ناٹو اقوام کی پوری کانفرنس کا پیش خیمہ ثابت ہو۔ اس افراتفری میں ایک بات قابل ذکر ہے کہ تمام متعلقہ اقوام مغرب اس کی متمنی ہیں کہ جمعیت یورپ کی کوئی قابل قبول شکل پیدا ہو جائے۔ لیکن یہ مشترک خواہش انھیں کسی عملی دفاعی تنظیم پر متفق کرنے کا باعث ہو سکی یا نہیں اس کے متعلق کچھ کہنا قبل از وقت ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ یہ خواہش غیر وقیع نہیں۔ اس کا مظاہرہ انہی دنوں ہوا۔ روس نے اقوام مغرب کے اختلافات سے فائدہ اٹھا کر اس سال کے شروع میں برلن کانفرنس کے موقع پر یہ تجویز پیش کی تھی کہ جمعیت یورپ میں اسے اور دیگر اقوام یورپ کو بھی شریک کیا جائے۔ اسے بعد میں بھی دہرایا گیا۔ بظاہر موجودہ صورت حال روس کے مفید مطلب ہونی چاہئے تھی لیکن امریکہ، برطانیہ اور فرانس نے روس کو جو جواب دیا ہے اس میں اس تجویز کو سختی سے مسترد کر دیا ہے۔ امریکہ کی یادداشت میں یہاں تک کہا گیا ہے کہ یورپ میں امن و امان کی بحالی کی صورت ایک عمومی معاہدہ سے نہیں ہو سکتی۔ یہ عملی مسائل کے حل کا نتیجہ ہوگی اور ایسے مسائل میں اہم ترین جرمن اور آسٹریا ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پوری اقوام اپنے اختلافات باہمی کے باوجود روس کی باتوں پر کان دھرنے کیلئے تیار نہیں۔

ایشیائی تگ و دو

یورپ کا سا ہیجان ایشیا میں بھی پایا جاتا ہے اور یہ بھی جینوا کانفرنس ہی کا شاخسانہ ہے۔ امریکی روس سے متعلق شروع سے ہی یہی رائے رہی ہے کہ وہ مفاہمت کیلئے تیار نہیں بلکہ محض امن کی جنگ لڑ رہا ہے اسلئے وہ اپنے حلیفوں کو اس پر آمادہ کرتا رہا کہ وہ مذاکرات کے فریب میں آکر اپنی دفاعی مساعی کو کم نہ کر دیں۔ اس مقصد کیلئے اس نے آغاز جینوا کانفرنس میں ہی یہ تجویز پیش کی کہ تمام مغربی طاقتیں مل کر ہند چینی کے تحفظ کی ضمانت دیں۔ گو اسوقت فرانس اور برطانیہ نے یہ تجویز پسند نہ کی کیونکہ وہ ہند چینی میں جنگ بند کرنے کے متمنی تھے لیکن بتدریج یہ تجویز ایک دفاعی تنظیم کی شکل اختیار کر گئی جس نے (SEATO) سیٹو یعنی جنوب مشرقی ایشیائی دفاعی تنظیم کا نام حاصل کیا۔ امریکہ کی خواہش اور کوشش تو یہ تھی کہ اس میں متعلقہ اقوام مغرب کے علاوہ اس علاقہ کی ایشیائی اقوام بھی شریک ہوں لیکن ہندوستان اس شرکت پر آمادہ نہ ہوا۔ اسکی وجہ، جیسا کہ سابقہ تبصروں میں لکھا جا چکا ہے، ظاہر ہے۔ ہندوستان کسی غیر اشتراکی دفاعی سلسلہ میں شریک ہو کر چین کو ناخوش نہیں کرنا چاہتا۔ دوسرے، اسے صاف نظر آرہا ہے کہ اگر ایشیا میں امریکہ کی قیادت میں کوئی دفاعی تنظیم قائم ہوگئی تو اس کا قیادت ایشیا کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکے گا۔ اسکے برعکس پاکستان کی پوزیشن واضح ہے۔ جنوب مشرقی ایشیا میں جس انداز سے اشتراکیت پھیل رہی ہے اس سے پاکستان مطمئن نہیں ہو سکتا نہ وہ خاموش رہ سکتا ہے کیونکہ مشرقی پاکستان اسکی زد میں ہے اسلئے ضروری ہے کہ پاکستان اس خطرے کے تدارک کیلئے دیگر اقوام ہم خیال سے اشتراک عمل کرے۔ وہ اس شرکت کیلئے کوئی قیمت وصول نہیں کرنا چاہتا الا یہ کہ اس کے حلیف اسے ہر قسم کے حملے سے بچائیں اور اسے فوجی اور معاشی اعتبارات سے مستحکم بنائیں۔ ہندوستان کی دیکھا دیکھی سیلون، برما اور انڈونیشیا نے سیٹو میں شرکت سے انکار کر دیا۔ اس معاہدہ کی ترتیب و تسوید کیلئے ۶ ستمبر کو منیلا (فلپائن) میں آٹھ اقوام کی کانفرنس منعقد ہوئی۔ یہ آٹھ اقوام پاکستان، امریکہ، برطانیہ، فرانس، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، فلپائن اور تھائی لینڈ (سیام) ہیں۔ معاہدے کے مسودے میں تحریر تھا کہ معاہدہ اشتراکی حملے کی صورت میں قابل عمل ہوگا لیکن پاکستان نے یہ اعتراض کیا کہ "حملے" کو اشتراکیوں تک محدود نہیں رکھا جانا چاہئے بلکہ اسے مطلق بنایا جانا چاہئے تاکہ معاہدہ اقوام میں سے کسی پر کہیں سے بھی حملہ کیوں نہ ہو اس کا مقابلہ کیا جائے۔ اس خیال کو اتفاق کر لیا گیا اور "اشتراکی" شرط اڑا دی گئی۔

معاہدہ کی چیدہ چیدہ شرائط یہ ہیں: معاہدہ آٹھ معاہد اقوام اور آزاد ویٹ نام، لاؤس اور کمبوڈیا کے علاقوں سے متعلق ہے۔ (برطانیہ کے اعتراض پر فارموسا کو معاہدہ کے تصرف سے نکال دیا گیا) ان علاقوں پر حملہ ہوا تو تمام اقوام اپنے دستوری قواعد کے مطابق اس کی مدد کو پہنچیں گی۔ اگر معاہدے کے علاقے میں مسلح حملے کے علاوہ کوئی اور خطرہ ہو (مثلاً خانہ جنگی، بغاوت وغیرہ) تو ارکان باہمی دفاع کے ذرائع سے متعلق فوری مشورہ کرینگے۔ ارکان فنی امداد اور معاشی ترقی کیلئے بھی تعاون کریں گے۔ تمام ارکان پر مشتمل ایک کونسل معاہدے پر عمل درآمد کریگی اور عسکری اور غیر عسکری منصوبہ بندی کریگی۔ معاہدہ کے ساتھ ایک "کالی منشور" (PACIFIC CHARTER) پر بھی دستخط کئے گئے ہیں جس میں عہد کیا گیا ہے کہ علاقہ میں آزادی و خود مختاری کیلئے حالات سازگار کئے جائیں گے۔ یہ معاہدہ بیک وقت عسکری بھی ہے اور معاشی اور سیاسی بھی۔ گویا متعلقہ علاقے کو نہ محض فوجی اعتبار سے مضبوط بنایا جائیگا بلکہ معاشی اور سیاسی اعتبار سے بھی اس کا درجہ بلند کیا جائے گا۔ اس معاہدے سے کوئی عسکری تنظیم (جیسا کہ ناٹو میں ہے) معرض وجود میں نہیں آئی اور یہ اس کا سقم ہے۔ اگر ایک مشترکہ فوج تیار کی جاتی تو اس کی افادیت اور بڑھ جاتی۔

امریکہ اور پاکستان

اس کا ایک اور کمزور بلکہ افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ ہر چند پاکستان کے کہنے پر یہ منظور کر لیا گیا کہ حملہ کہیں سے ہو اس کی مدافعت کی جائے، امریکہ نے عملاً اس شرط کو بے حقیقت بنا دیا ہے۔ اس نے ایک علیحدہ یادداشت شائع کی ہے جس میں تحریر ہے کہ اشتراکی حملے کی صورت میں تو وہ معاہدے کی شرط کے مطابق عمل کریگا لیکن غیر اشتراکی حملے کی صورت میں وہ محض مشورہ کریگا۔ گویا عین ممکن ہے کہ غیر اشتراکی حملے کی صورت میں معاہدہ حرکت میں آ ہی نہ سکے۔ یہ صورت پاکستان کیلئے خوش آئند نہیں کیونکہ پاکستان کو فوری اور حقیقی خطرہ غیر اشتراکی ذرائع سے ہے۔ نیز معاہدہ میں ایک شرط رکھنے کے بعد اسے غیر موثر بنانا معاہدے کیلئے نیک فال نہیں ہو سکتا۔ برطانیہ نے بھی اس ضمن میں کہا کہ ہمیں ہندوستان اور پاکستان کی باہمی نزاع سے کوئی سروکار نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ امریکہ اور برطانیہ دونوں پاکستان پر ہندوستانی حملے کی صورت میں کوئی اقدام کرنا نہیں چاہیں گے۔ امریکہ اور برطانیہ نے ایسا ہندوستان کو خوش کرنے کیلئے کیا ہے۔ انہیں اپنے مقاصد کیلئے ہندوستان سے تعلقات پیدا کرنے اور اسے خوش کرنے کا پورا حق حاصل ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ان کیلئے آخر کار یہ حکمت عملی مفید ہو سکتی ہے کہ وہ پاکستان جیسے حقیقی اور معتمد دوستوں کو تو چنداں اہمیت نہ دیں لیکن ہندوستان جیسے مشکوک ملک پر احسانات کی بارش کر دیں۔ اسوقت ہندوستان کی یہ حالت ہے کہ وہ چین سے دوستی کی پینگیں بڑھا رہا ہے اور قدم قدم پر امریکی دفاعی منصوبوں کی مخالفت کرتا جا رہا ہے۔ اس کے مقابلے میں پاکستان نے امریکہ سے فوجی معاہدہ تک کر لیا اور پوری طرح اس کے منصوبوں میں شریک ہونے کیلئے تیار ہے۔ مزید برآں پاکستان کی اہمیت واضح ہے۔ اس کا ایک قدم مشرق وسطیٰ میں ہے اور دوسرا جنوب مشرقی ایشیا میں۔ وہ نہ محض عالم اسلامی کو متحد کرنے کا باعث ہو سکتا ہے بلکہ ایشیا میں ہندوستان کی دوعملی چالوں کا خاطر خواہ جواب دے سکتا ہے۔ اس طرح جہاں پاکستان امریکہ کی دوستی سے چند در چند فوائد حاصل کر سکتا ہے وہاں امریکہ بھی کئی حیثیتوں سے نفع کا سودا کر سکتا ہے۔ لیکن امریکہ نے ابھی تک اس کا ثبوت نہیں دیا کہ وہ ایک معتمد دوست اور غیر دوست میں فرق کر سکتا ہے۔ وہ ہندوستان کو بلا شرط معاشی امداد دے رہا ہے بلا شرط اسلئے کہ معاشی امداد حاصل کر کے ہندوستان اپنے مالی ذرائع کو زیادہ سے زیادہ عسکری تنظیم پر صرف کر سکتا ہے۔ ایسا کرنے میں وہ مطلقاً مکلف نہیں ہے کہ فوجی قوت پاکستان کے خلاف استعمال نہ کرے۔ فوجی معاہدے کی رو سے پاکستان کو یہ اجازت نہیں۔ گویا جو ملک امریکہ سے فوجی معاہدہ تک کر لیتا ہے وہ تو پابند ہے لیکن جو ملک یعنی ہندوستان امریکہ کے راستے میں روڑے اٹکاتا رہتا ہے وہ جارحانہ اقدامات کیلئے آزاد ہے اور امریکہ کی مدد کے صحیح یہ تضاد صریح ہے لیکن قابل فہم بھی ہے۔ اس کا ارتفاع امریکہ کے ہاتھ میں اتنا نہیں جتنا پاکستان کے ہاتھ میں ہے۔ اگر قائدین پاکستان تدبر سے کام لیں تو وہ امریکہ پر اپنی اہمیت جتا سکتے ہیں اور عملاً بہتر سے بہتر سودا کر سکتے ہیں۔ نتائج معاہدوں کے الفاظ نہیں بلکہ قائدین کے فہم و شعور اور عمل سے برآمد ہوتے ہیں مشرق و مغرب کی عالمگیر کشمکش میں پاکستان جو ذمہ داریاں سنبھالتا چلا جا رہا ہے وہ اس کی اہمیت کے عین مطابق ہیں۔ بشرطیکہ ان کے نتائج اسی صورت میں خاطر خواہ ہوں گے کہ پاکستانی قیادت حقیقی قومی شعور سے ہمکنار ہو۔

نیا ہنگامہ!

ادھر غیر اشتراکی قومیں سیٹو کی ترتیب میں مصروف تھیں، ادھر چین نے گرمیٔ خون کا مظاہرہ کرنا شروع کر دیا۔ چین کے ساحل کے قریب ایک جزیرہ ہے جس کا نام کویمائے ہے اور جو غیر اشتراکی قبضے میں ہے۔ پانچ سال پیشتر اشتراکیوں نے سارے ملک کو فتح کر کے اس جزیرے پر حملہ کیا تھا لیکن نیشنلسٹوں نے ایسا جواب دیا کہ اس کے بعد سکوت چھا گیا۔ ان دنوں اشتراکیوں نے پھر اس جزیرے پر حملے شروع کر دیئے جن کا نیشنلسٹوں نے منہ توڑ جواب دیا۔ یہ حملہ کیوں کیا گیا، اس کی کوئی حتمی توجیہ نہیں کی جا سکتی۔ یہ یقینی ہے کہ اس جنگ میں اشتراکی کسی قابلِ ذکر فوجی فتح کی توقع نہیں رکھ سکتے تھے۔ نہ اسے فارموسا پر حملے کا پیش خیمہ ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس سے بہرحال دنیا کی توجہ اپنی طرف ضرور مبذول کر لی ہے۔ امریکہ نے اعلان کیا ہے کہ اشتراکیوں کو فارموسا تک پہنچنے کیلئے امریکہ کے ساتویں جنگی بیڑے کے اوپر سے گزرنا ہوگا جو فارموسا کے سمندر میں پڑا ہوا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ سرخ چین کا مقصد یہ ہو کہ ایک مرتبہ پھر ایشیائی اقوام کو یاد دلایا جائے کہ یہ فتنہ سامانی امریکہ کی وجہ سے ہے۔ اور اسی کی بدولت امن کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ یہ خیال پیدا کرنے کی ضرورت اسے اسلئے پیش آسکتی ہے کہ اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی میں اس کا مسئلہ عنقریب پیش ہونے والا ہے اور اس کی کوشش یہ ہے کہ ایشیائی رائے اس کے حق میں اور امریکہ کے خلاف ہو جائے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس ہنگامے سے اس کا مقصد یہ ہو کہ چینی سمندر میں امریکی قوت کا اندازہ لگایا جا سکے۔ اس کی وجہ کچھ بھی ہو چین کا معاملہ اقوامِ مغرب کیلئے پھر سے دردِ سر بننے والا ہے۔ برطانیہ چین کو ناراض نہیں کرنا چاہتا، اس لئے اس نے سیٹو میں فارموسا کو شریک نہیں کرنے دیا۔ اس کے برعکس امریکہ کی روش کلیتہً غیر مصالحانہ ہے۔ جنرل اسمبلی میں پھر معرکہ ہوگا جس کا نتیجہ یہ تو نہیں ہو سکتا کہ چین کو اقوامِ متحدہ میں شریک کر لیا جائے لیکن اقوامِ مغرب کیلئے نفاق کا ایک اہم مسئلہ سامنے ضرور آجائے گا۔

جب مسٹر فرانس نے ہند چینی سے فارغ ہو کر ۳۱ جولائی کو ٹیونس کو اندرونی خود مختاری کی پیشکش کی تھی۔ اس پیشکش کا عمومی طور پر خیر مقدم کیا گیا تھا حتیٰ کہ قومی قائد حبیب بورقیبہ نے نظر بندی کی حالت میں بھی اس کو سراہا تھا۔ اس پیشکش کو عملی جامہ پہنانے کیلئے پیرس میں فرانسیسی اور ٹیونس ماہرین کے مذاکرات شروع ہو گئے ہیں۔ ان مذاکرات میں فرانس میں ٹیونسیوں اور ٹیونسیا میں فرانسیسیوں کے حقوق کے تعین اور تحفظ کا فیصلہ ہوگا۔ دونوں ممالک کے معاشی اور مالی تعلقات کی تعریف ہوگی اور فرانس کی فوجی اور امورِ خارجہ سے متعلق ذمہ داریوں کا تصفیہ ہوگا۔ اس ضمن میں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ فرانس نے حبیب بورقیبہ کو قریباً آزاد کر دیا ہے۔ بورقیبہ جنوری ۱۹۵۲ء میں نظر بند ہوئے تھے۔ اب انھیں مشاورت کیلئے پیرس میں لا رکھا تھا۔ ان کی رہائی مکمل نہیں کیونکہ انھیں فرانس سے باہر بالخصوص ٹیونسیا جانے کی اجازت نہیں۔ اس سے فرانس کی حکمتِ عملی کی تبدیلی کا پتہ چلتا ہے۔ اگر فرانس کا رویہ اسی طرح مصالحانہ رہا تو وہ دن دور نہیں کہ ٹیونس اندرونی خود مختاری سے ہمکنار ہو جائے۔

کوائفِ مصر

قضیۂ سویز کے حل ہو جانے سے توقع پیدا ہو چلی تھی کہ مصر کے حالات و کوائف میں توازن قائم ہو جائے گا، لیکن ابھی تک یہ ایک خام تمنا ہی ثابت ہوئی ہے۔ جمال عبدالناصر اور جنرل نجیب کی نزاع تو مصری سیاست کو ناہموار کئے ہوئے تھی ہی، اب اس میں مزید ناہمواریاں بھی پیدا ہو گئی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ معاہدہ سویز کو مصر میں بہ نظرِ استحسان نہیں دیکھا گیا۔ خود کابینہ میں اختلافات نمودار ہو گئے ہیں۔ دو بھائی صالح سلیم اور جمال سلیم جو جمال ناصر کے دستِ راست ہیں اور کابینہ میں ہیں ایک دوسرے کے شدید نکتہ چیں ہیں۔ انہی دنوں ایک بھائی کی نکتہ چینی پر دوسرے بھائی صالح سلیم نے استعفا دے دیا لیکن پھر ناصر نے بیچ بچاؤ کر کے صالح سلیم کو منوا لیا۔ ناصر ایک مرتبہ کابینہ کی ترتیبِ نو کر چکے ہیں، لیکن یہ کہنا قبل از وقت ہے کہ وہ ہم آہنگی پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ محض یہی نہیں بلکہ ملک کی بہت بڑی جماعت "اخوان المسلمون" بھی حکومت کے خلاف ہوتی جا رہی ہے۔ یوں تو اس منظم اور وسیع جماعت کے تعلقات مصر کی فوجی حکومت سے کبھی خاطر خواہ نہیں ہوئے لیکن اب ان کے اختلافات تصادم کی صورت اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ ان ہی دنوں قاہرہ میں اخوان المسلمون اور پولیس میں شدید تصادم ہوا۔ پھر اخوان کے قائد حدیبی کو معزول کرنے یا کرانے کی ناکام کوشش ہوئی۔ اس کے بعد حدیبی نے جمال ناصر کو ایک خط لکھا جس میں تحریر تھا کہ "اس وقت آپ مصر کی گلیوں میں پھرتے ہیں تو جماعت کا آدمی

آپ کو ہاتھ تک نہیں لگانا لیکن اگر آپ باز نہ آئے تو نتائج خطرناک ہونگے۔ ان الفاظ سے گویہاں تک نتیجہ نکالا گیا ہے کہ حدیبی نے وزیر اعظم مصر کو قتل کی دھمکی دی ہے۔ لیکن اگر اسے درست نہ بھی مانا جائے تو اتنا ضرور کہنا پڑے گا کہ الفاظ سخت ہیں اور وہ شدید کشیدگی تعلقات کے آئینہ دار ہیں۔

اس اندرونی خلفشار کا نتیجہ ہے کہ مصر بین الاقوامی سیاست میں چنداں موثر نہیں ہو سکا۔ وہ ابھی تک مغرب کے معاملہ میں اپنا رویہ واضح نہیں کر سکا۔ حال ہی میں فوجی کونسل کی طرف سے یہ اعلان کیا گیا کہ مصر مغرب کے ساتھ ہے اور اس میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں۔ لیکن دوسرے ہی دن اسکی یہ کہہ کر وضاحت کر دی گئی کہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ مصر کسی قسم کی مغربی دفاعی تنظیم میں شرکت کیلئے تیار ہے۔ اس کا مفہوم کچھ بھی ہو، اس سے یہ ضرور ظاہر ہے کہ مصر کوئی واضح موقف طے نہیں کر سکا یا اس کے حالات اسے ایک طرف نہیں ہونے دیتے۔ وہ غیر جانبداری کا بھی خواب بھی دیکھ رہا ہے لیکن اس کے ساتھ عربوں کو اپنے پیچھے متحد کرنے کی فکر میں بھی ہے۔ چنانچہ ان دنوں عربی دارالحکومتوں میں کافی آمد و رفت ہو رہی ہے۔ مصر نے اسی سلسلہ میں حج کے موقعہ سے بھی فائدہ اٹھانا چاہا ہے اور گو اسے عالم اسلامی کی کانفرنس کے بلند بانگ نام سے یاد کیا جا رہا ہے لیکن اس کی تہ میں "عربیت" کا عجمی تصور کارفرما ہے۔ اس میں مصر کی کامیابی آسان نظر نہیں آتی کیونکہ ایک طرف عرب ممالک اس حد تک ایک دوسرے سے علیحدہ ہیں کہ بحالات موجودہ یہ توقع عبث ہے کہ وہ باہمی رقابتوں کو بالائے طاق رکھ کر بلند تر مقصد کیلئے مجتمع ہو سکیں گے۔ دوسرے مصر یا کسی اور ملک نے اسلام کا نام لیکر عربوں کو متحد کرنا چاہا تو لامحالہ دوسری قوموں بالخصوص پاکستان کی شرکت ناگزیر ہو جائیگی۔ اس سے کوئی اتحاد علاقائی یا نسلی نہیں رہ سکے گا۔ دراصل حالات کا تقاضا یہی ہے کہ مسلمان بحیثیت مسلمان یکجا و متحد ہوں اور مشترکہ محاذ قائم کر کے عالمی سیاست میں توازن قائم کریں۔ مختلف "مسلمان قومیں" اپنے اپنے مفاد کی خاطر اتحاد کے نعرے نہ لگائیں۔ سب مسلمان ایک ملت کے افراد ہیں۔ ان کی مختلف قوموں کا تصور یکسر غیر اسلامی ہے۔

عراقی برطانوی معاہدہ عراق میں حال ہی میں نئے انتخابات ہوئے ۱۳۸۔ ارکان کے ایوان زیریں کیلئے نوری السعید کے حامیوں اور استقلال پارٹی نے مقابلہ کیا۔ بقیہ تمام پارٹیوں نے بدیں وجہ انتخابات میں حصہ نہیں لیا کہ انھیں خدشہ تھا کہ انتخابات آزاد اور غیر جانبدار نہیں ہوں گے۔ اس معرکے میں استقلال پارٹی نے صرف دو نشستیں جیتیں لیکن جب پارلیمان کا افتتاح ہوا تو انھوں نے بھی احتجاجاً شرکت سے انکار کر دیا اور دونوں ارکان مستعفی ہو گئے۔ نوری السعید کی کامیابی ویسے بھی یقینی متصور کی جاتی تھی۔ ان کی کامیابی سے ایک مسئلہ خصوصیت سے ابھر کر سامنے آجائے گا اور وہ ہے برطانوی عراقی معاہدہ کی اصلاح و ترمیم۔ یہ معاہدہ جون ۱۹۳۰ء میں طے ہوا تھا اور اس کا نفاذ ۱۹۳۲ء میں عمل میں آیا تھا جب عراق بحیثیت آزاد ملک مجلس اقوام کا رکن بن گیا تھا۔ اس کی میعاد اکتوبر ۱۹۵۷ء میں ختم ہو رہی ہے۔ اس کی رو سے برطانیہ کے قبضہ میں حبانیہ (بغداد کے مغرب میں) اور شعیبہ (بصرہ کے نزدیک خلیج فارس کے منہ پر) کے ہوائی اڈے ہیں۔ اس صورت حال سے ایک عرصہ سے عدم اطمینان کا اظہار کیا جا رہا ہے اور معاہدہ کی اصلاح کا مطالبہ ہو رہا ہے۔ گذشتہ جولائی میں نوری السعید نے شاہ فیصل کو ایک خط میں لکھا تھا کہ ان کی خارجہ حکمت عملی کا نقطہ ماسکہ اس معاہدہ کی تنسیخ ہوگی۔ اب انتخابات ختم ہو جانے پر عراق اور برطانیہ کو سر جوڑ کر بیٹھنا اور اس کا تصفیہ کرنا ہوگا۔

ایران ایران کے تیل کے معاہدہ پر حکومت نے دستخط کر دیئے ہیں اور اب اسے مجلس میں تصدیق کیلئے پیش کیا جا رہا ہے۔ ادھر تصدیق کی تیاریاں ہو رہی ہیں ادھر فوج میں ایک وسیع سازش پکڑی گئی ہے۔ یہ سازش سرخ عناصر کی طرف سے ہو رہی تھی اور اس کا مقصد یہی ہو سکتا تھا کہ معاہدہ کے نفاذ کو ناممکن العمل بنایا جائے تاکہ ایران پر سرخ قبضہ کا راستہ صاف ہو سکے۔ چنانچہ کوئی چار سو کے قریب فوجی افسروں کو اس الزام میں گرفتار کر لیا گیا ہے کہ وہ روسی جاسوسی سلسلہ میں منسلک تھے۔ اس میں وزیر اعظم کے باڈی گارڈ کا افسر اعلیٰ بھی شامل ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سرخ عناصر کا اثر اندر اندر کہاں تک سرایت کر چکا ہے۔ اس کی وجہ بہت حد تک یہی ہے کہ تیل کے کارخانے معطل ہو جانے کی وجہ سے ایران معاشی طور پر تباہ ہو رہا ہے جس کا فائدہ سرخ جاسوس اٹھا رہے ہیں۔ اگر تیل کے کارخانے پھر سے چلنے شروع ہو جائیں اور ایرانی

سیاست و معیشت میں توازن کی شکل پیدا ہو جائے تو اس خطرے کا بہت حد تک مقابلہ کیا جا سکے گا ورنہ ایران کے لئے روسی خطرہ دن بدن یقینی ہوتا جائے گا۔

ہندو استعماریت

پنڈت نہرو کا ہندوستان ایک خالص استعماری ملک بنتا جا رہا ہے۔ ہندوستانی استعماریت دیگر استعماریتوں کے برعکس سیاسی کے علاوہ مذہبی بھی ہے۔ گو سیاست و مذہب کے علمبردار متفرق گروہ ہیں لیکن ان میں عجیب و غریب صورت سے تعاون ہو رہا ہے پنڈت نہرو سیاست میں وہ کچھ کرتے ہیں جو "فرقہ وار" ہندو جماعتیں مذہب کے معاملے میں کرتی ہیں۔ مثلاً سیاسی اعتبار سے وہ اس کیلئے کوشاں ہیں کہ ہندوستان میں لادینی حکومت قائم ہو جسے کہنے کو تو مغربی تصور کی "سیکولر سٹیٹ" ہے لیکن اس کا مقصد جملہ مذاہب غیر از ہندومت کو مٹانا ہے۔ وہ فرقوں کے امتیازات ختم کر کے ایک فرقہ ہندو (ہندوستانی) بنانا چاہتے ہیں۔ ان دنوں ان کے ہاں شادی کا جو بل منظور ہوا ہے، اس میں "سول میرج" کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے اور گو اس کا اطلاق ان پر ہوگا جو رضامندی سے اسے قبول کریں گے، لیکن پنڈت نہرو نے اس سے متعلق تقریر کرتے ہوئے صاف صاف کہا کہ وہ ہندوستان میں صرف ایک ہی فرقہ ـــ ہندوستانی ـــ باقی دیکھنے کے متمنی ہیں۔ گو انھوں نے مخالفین کا منہ بند کرنے کیلئے یہ کہہ دیا کہ وہ اس طرح مذاہب کو ختم کرنا نہیں چاہتے لیکن اس خاکہ میں رنگ عمل مہا سبھا اور دیگر خالصتاً ہندو جماعتیں بھر رہی ہیں۔ مسلمان تو ان کے شروع سے شکار تھے ہی، اب انھوں نے دیگر مذاہب کی طرف بھی توجہ دینا شروع کر دی ہے۔ مسلمانوں کے بعد انھیں سب سے بڑا خطرہ عیسائیت سے ہے چنانچہ عیسائیت کی تبلیغی جماعتوں پر پابندیاں لگائی جا رہی ہیں۔ حکومت انھیں غیر ملکی کہہ کے ان کی راہ میں روڑے اٹکا رہی ہے اور ہندو مذہبی جنون میں ان کی زندگی اجیرن بنا رہے ہیں۔ مسلمان جنھیں وہاں کبھی اطمینان کا سانس لینا نصیب نہیں ہوا، ان کے خلاف پھر سے فسادات کی تحریک شروع ہو گئی ہے۔ ان ہی دنوں متعدد جگہوں پر فسادات ہوئے ہیں جن میں زیادہ شدت سے ریاست حیدرآباد اور یوپی میں ہوئے ہیں۔ یہ سلسلہ بدستور جاری ہے۔ اس سے مسلمان مہاجرین کی پاکستان میں آمد کا سلسلہ تیز تر ہو گیا ہے۔ فسادات کی یہ رَو اتنی شدید ہے کہ جمعیت العلماء ہند جن کی عمومی پالیسی کانگرس پسندانہ رہی ہے، انھوں نے اسمبلیوں کے مسلمان اراکین سے اپیل کی ہے کہ وہ اس کے خلاف احتجاج کے طور پر مستعفی ہو جائیں۔ ان کا ایک وفد پنڈت نہرو سے بھی مل رہا ہے۔ خود پنڈت نہرو کو بھی ایک بیان میں فسادات کی مذمت کرنا پڑی حالانکہ اگر یہ حوادث اکا دکا ہوتے تو انھیں بولنے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی۔ اب ان مسلم کش سرگرمیوں کا رخ کشمیر کی طرف پلٹتا نظر آتا ہے۔ جموں کا صوبہ پہلے سے ہی ہندو بنا لیا گیا ہے۔ باقی ریاست کے بے بس مسلمانوں کا جو حشر ہو سکتا ہے اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

ہندوستان جس راہ پر چل رہا ہے اس سے یہ نتیجہ نکالنا مشکل نہیں کہ ہندوستان ایک ہندو سلطنت کا خواب دیکھ رہا ہے۔ یہ تصور ہٹلر کے آریائی برتری اور جرمن تفوق سے مشابہ ہے۔ ہندوستان اپنے آپ کو برتر اور برگزیدہ ملک اور ہندومت کو اپنا "مشن" بنا رہا ہے۔ اس نئی قسم کی استعماریت کا نشانہ مسلمان ممالک ہوں گے اور اس کی فیصلہ کن ٹکر پاکستان سے ہوگی۔ اگر اس خطرے کو ابھی سے محسوس کیا گیا تو اس کا مقابلہ مشکل نہیں ہوگا۔ اگر پاکستان نے ذرہ بھر بھی کوتاہی کی تو عالم اسلامی کے لئے ایک گھناؤنا خطرہ پیدا ہو جائے گا۔ پاکستان کی ذمہ داری اس لئے بھی بڑھ جاتی ہے کہ دیگر مسلمان ممالک اس خطرے کو محسوس نہیں کر رہے۔

اپنا اعمالنامہ!

کیا پاکستان اس کا حریف ہو سکے گا؟ اگر اس کا جواب لیڈروں کے "عمل" میں تلاش کیا جائے تو وہ مایوس کن ہوگا۔ قائدین اپنے اپنے استحکام و تفوق میں الجھے ہوئے ہیں اور اس جنگ زرگری میں ملک کا مفاد پس پشت ہو گیا ہے۔ پاکستان میں ہنوز رائے عامہ بیدار نہیں ہو سکی جو قائدین کے اقوال و افعال پر نگاہ رکھے۔ اس کا فائدہ اٹھا کر لیڈران قوم خود ہی فریضہ تنقید کو ادا کر رہے ہیں ـــ ۱۱ ستمبر کو قائد اعظم کی برسی کے سلسلہ میں کراچی کی جہانگیر پارک میں وزیر اعظم سمیت کئی لیڈرانِ قوم نے ایک پبلک جلسہ سے خطاب کیا۔

ان میں سے ہر ایک نے "قومی قیادت" پر کڑی نکتہ چینی کی کیونکہ اس سے ملک میں صوبائیت، اقربا نوازی، رشوت، چور بازاری، نااہلیت وغیرہ وغیرہ فتنے پیدا ہو گئے ہیں۔ بات صحیح ہے لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کونسی قومی قیادت ہے جس نے یہ فتنے اٹھائے؟ آخر آپ حضرات ہی تو ہیں جنھوں نے ملک کی قیادت اپنے ہاتھ میں لے رکھی ہے۔ لیکن ضمیر کی ملامت سے بچنے کی یہ صورت بھی خوب ہے کہ یہ فساد (میرا نہیں بلکہ) فلاں کا پیدا کردہ ہے۔ "فلاں" کو غیر مشخص رکھ کر ہر شخص اطمینان سے تنقید کا فرض ادا کر سکتا ہے۔ سننے والے ہر تقریر کو سن کر سمجھتے ہوں گے کہ یہ حضرت تو فرشتے ہیں، شیطان کوئی اور ہیں۔ اس کے بعد اور صاحب تشریف لائے، پھر اور، پھر اور، لیکن وہ "مجرم" کہاں ہے جس نے ملک و ملت کو اس فساد عظیم کا شکار بنا دیا ہے؟ قوم احتساب کی ذمہ داری ادا نہ کرے تو کون "اقبال جرم" کرے گا!

یہی نکتہ چینی قوم کی تقدیر تشکیل کرنے کیلئے مجلس دستور ساز کی شکل میں جمع ہوتے ہیں اور مسئلہ پیش نظر یہ ہے کہ مرکز اور صوبوں کے درمیان تقسیم اختیارات کیسے ہو۔ اس موقع پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر مغربی پاکستان کو ایک، وحدت بنا دیا جائے تو ایک عمومی وحدت کا شعور پیدا ہو جائیگا جس سے صوبائیت کی بجائے پاکستانیت ابھرے گی۔ تنہا مغربی پاکستان کے ایک یونٹ بنانے کا سوال اسلئے پیدا ہوا کہ مشرقی اور مغربی بازوؤں کے درمیان فاصلے کی وجہ سے دونوں کا ایک یونٹ بنانا محال ہے۔ نیز اس وحدت سے مشرق و مغرب میں توازن بھی پیدا کیا جا سکتا ہے۔ لیکن مشرقی پاکستان کے "قومی" لیڈر آگے بڑھتے ہیں اور اس کا منظور ہونا ناممکن بنا دیتے ہیں کیونکہ یہ وحدت ان کے مفاد کے منافی ہے۔ یہی نہیں بلکہ خود مغربی پاکستان میں "لیڈران" قوم کو ابھارا جاتا ہے کہ وہ وحدت کی مخالفت کریں ان نفاق انگیز سرگرمیوں کو "قومی" سمجھا جاتا ہے اور پھر شکایت کی جاتی ہے کہ ملک میں ناہمواریاں ہی ناہمواریاں ہیں۔ ملکی سیاست کا ایک پہلو یہ بھی افسوسناک ہے کہ فیصلوں کا اختیار ایک بھان متی کے کنبے کے ہاتھ آگیا ہے جسے مسلم لیگ پارلیمانی پارٹی کہا جاتا ہے۔ اس پارٹی میں یوں تو بھانت بھانت کی بولیاں بولی جاتی ہیں لیکن بنگالی بولی سب سے زیادہ چلتی ہے۔ تمام بنگالی یک زبان ہو کر جو چاہتے ہیں (اور جب چاہتے ہیں) منظور کر لیتے ہیں اور وہ قانون بن جاتا ہے۔ چنانچہ ایک یونٹ کا مسئلہ جب اس پارٹی کے سامنے آیا تو بنگالی اکثریت نے اسے مسترد کر دیا۔ چونکہ معاملہ پارٹی کا ہے اسلئے باقی ارکان پارٹی ڈسپلن کی خاطر منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں اور اندر جو فیصلے ہوتے ہیں وہ چپکے سے مجلس دستور ساز میں جا کر اکثریت کے زور پر پاس ہو جاتے ہیں۔ نہ قوم کو یہ پتہ چلتا ہے کہ کیا فیصلے ہوں گے، نہ یہ کہ ان کے مالہ و ماعلیہ کیا ہیں۔ بس ایک نام نہاد پارٹی ایک فیصلہ کرتی ہے اور وہ ملک پر مسلط ہو جاتا ہے اسے جمہوریت کا نام دیا جا رہا ہے!

لسانی فارمولے کے وقت ایسا ہی ہوا تھا۔ پارٹی کے اندر بنگالی ارکان نے اکثریت کے زور پر ایک "فارمولا" منظور کر دیا۔ ایک یونٹ کے سلسلہ میں بھی یہی ہوا۔ انھوں نے اکثریت کے زور پر اسے ختم کر دیا۔ ہمارے سیاست دان چونکہ قوم سے دور ہیں اور انھیں قومی تائید حاصل نہیں۔ نہ انھوں نے کبھی اس کے حصول کی کوشش ہی کی ہے۔ اسلئے ان میں اتنی جرأت نہیں ہوتی کہ وہ اپنے موقف کیلئے کچھ قربانی کر سکیں۔ مثلاً اگر مغربی وحدت کے حامی یہ سمجھتے تھے کہ پاکستان کا مفاد اس وحدت میں ہے تو انھیں اس کے استرداد کی صورت میں پارٹی سے مستعفی ہو جانا چاہئے تھا۔ اگر اس طرح جرأت سے کام لیا جائے تو جمہوری طور طریقوں کے نشوونما کی توقع کی جا سکتی ہے ورنہ موجودہ آمریت سخت تر ہو جائیگی اور قومی مسائل پر بحث تمحیص اور استصواب کا راستہ بالکل بند ہو جائیگا۔ یہی قوموں کی حقیقی موت ہوتی ہے اور ہم اس قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہوئے ہیں!

کتنا بلند تھا یہ دعویٰ کہ تمام ہندوستان میں بسنے والے مسلمان ایک قوم کے فرد ہیں جو اپنی جداگانہ مملکت چاہتے ہیں۔ اور اب کتنا پست ہے یہ عمل کہ بنگالی، سندھی، پنجابی، سرحدی، بلوچی مسلمان الگ الگ "قومیں" ہیں جو اپنے اپنے مفاد کی خاطر ایک دوسرے سے دست بگریباں ہو رہی ہیں!

ادارہ طلوع اسلام کی مطبوعات ایک نظر میں

اسلامی نظام دورِ حاضرہ کی ایک بلند پایہ کتاب جس میں بتایا گیا ہے کہ ایک اسلامی مملکت کے نظام اور آئین کے بنیادی اصول کیا ہیں، وہ نظام آج کس طرح قائم ہو سکتا ہے۔ اس میں محترم پرویز صاحب اور علامہ اسلم صاحب جیراجپوری کے وہ مقالات شامل ہیں جنہوں نے قوم کے سنجیدہ طبقہ کے سامنے فکر و نظر کی نئی راہیں کھول دی ہیں۔ ضخامت ۴۸۰ صفحات، مجلد مع گرد پوش۔ قیمت دو روپے (علاوہ محصول ڈاک)

قرآنی دستور پاکستان آئینی جد و جہد کے سلسلے میں ادارہ طلوع اسلام کی پیشکش قرآن کی روشنی میں مسودات قرارداد مقاصد بنیادی اصول و حقوق حکومت کے اعلان کے جواب میں بھیجے گئے۔ ساتھ ہی حکومت کی جانب سے پاس کردہ قرارداد مقاصد اور بنیادی اصولوں کی پہلی رپورٹ پر قرآن کی روشنی میں تنقید، مولوی صاحبان کے بائیس نکات کا تجزیہ، اسلامی جماعت کی دستوری سفارشات پر تبصرہ۔ ضخامت ۲۲۴ صفحات مجلد مع گرد پوش، دو روپے آٹھ آنے

اسباب زوالِ امت (دوسرا دور) دورِ حاضرہ کی انقلاب آفریں کتاب۔ مختصر مگر ہماری ہزار سالہ تاریخ کا نچوڑ، جس نے قوم کے سنجیدہ تعلیم یافتہ طبقہ کے قلب و نگاہ میں انقلاب پیدا کر دیا۔ مسلمانوں کی ہزار سالہ زندگی میں پہلی مرتبہ صحیح طور پر بتایا گیا ہے کہ ہمارا مرض کیا ہے اور اس کا علاج کیا؟ صفحات ۱۵۰۔ مجلد طلائی گرد پوش۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔

نوادرات علامہ حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری کے نادر مضامین کا قابل قدر مجموعہ۔ ضخامت ۴۰۰ صفحات۔ قیمت چار روپے۔

قرآنی فیصلے دورِ حاضرہ کی ایک اہم کوشش جس میں روزمرہ زندگی کے تقریباً ساٹھ اہم مسائل و معاملات کے متعلق قرآن کی روشنی میں بحث کی گئی ہے کہ ان مسائل اور معاملات میں قرآن پاک کا کیا فیصلہ ہے۔ یہ کتاب آپ کو دوسرے سہاروں سے بے نیاز کر دیگی۔ ضخامت ۴۰۸ صفحات۔ قیمت مجلد مع گرد پوش چار روپے۔

جشن نامے بلند حقائق کا مجموعہ اور عبرت و موعظت کا مرقع، ایسے ایسے عنوانات جنہیں پڑھکر بیک وقت آپکے ہونٹوں پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں آنسو آجائیں۔ طنز اور تنقید کے ایسے گہرے نشتر، اثر و درد کے ایسے خونچکاں منظر شاید ہی کہیں مل سکیں۔ یہ کتاب ہماری سات سالہ دورِ آزادی کی سمٹی ہوئی تاریخ ہے۔ ضخامت ۳۵۱ صفحات۔ قیمت مجلد مع گرد پوش دو روپے آٹھ آنے۔

معراج انسانیت:۔ مفصل اشتہار صفحہ ۵۴ پر ملاحظہ فرمائیں۔ قیمت بیس روپے۔

سلیم کے نام خطوط: مفصل اشتہار صفحہ ۶۵ پر ملاحظہ فرمائیں۔ قیمت چھ روپے

مزاج شناسِ رسول: مفصل اشتہار ٹائیٹل کے دوسرے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں۔ قیمت چار روپے

اسلامی معاشرت: مفصل اشتہار ٹائیٹل کے آخری صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں۔ قیمت دو روپے

مقامِ حدیث قیمت جلد اول چار روپے۔ " " " جلد دوم چار روپے۔

ادارہ طلوع اسلام۔ پوسٹ بکس نمبر ۷۳۱۲۔ کراچی